علیم الحق حقّی
لہو کے تاجر
جاسوسی نشست
JASOOSI NASHIST

لہو کے تاجر

علیم الحق حقی

اس معصوم دوشیزہ کا احوال جو کھیل ہی کھیل میں دہشت گرد بن گئی تھی

بچے دشمن ہی کے کیوں نہ ہوں، لائقِ شفقت و محبت ہوتے ہیں۔ وہ لوگ آج بھی زمانۂ جاہلیت میں ہیں جو اپنے جائز و ناجائز مقاصد کی تکمیل کے لیے معصوم بچوں کو اغوا کرتے ہیں اور انہیں یرغمال بناتے ہیں۔ اس ماہ ایسا ہی ایک واقعہ چند روز پیشتر پیش آچکا ہے جب پشاور کے ایک اسکول سے طلبہ کی خاصی بڑی تعداد کو اغوا کر کے اسلام آباد لے جایا گیا۔ یہ واقعہ ایسا نہیں تھا کہ کوئی ذی ہوش اس سے نظریں چرائے یا اس کا اثر قبول کیے بنا رہے۔ خصوصاً ایک ادیب تو ویسے بھی کچھ زیادہ ہی حساس طبع ہوتا ہے۔ وہ تو جو کچھ لکھتا ہے اپنے اِرد گرد وقوع پزیر ہونے والے حالات و واقعات سے متاثر ہو کر ہی لکھتا ہے۔ زیرِ نظر کہانی بھی ایسے ہی لمحوں کا شاخسانہ ہے۔ اس کہانی میں علیم الحق حقی نے ایک ایسی ہی صورتِ حال کی عکاسی کی ہے جب چند دہشت گردوں نے ایک اسکول کے طلبہ کو یرغمال بنا لیا تھا۔ علیم کی یہ تحریر صرف اغوا برائے تاوان ہی کی داستان نہیں بلکہ اس کی دیگر جہتیں بھی خاصی چشم کُشا اور قابلِ غور ہیں۔ ہمارے معاشرے میں پھیلنے والی ایک برائی سے لے کر ملک و قوم کے دیگر داخلی اور خارجی معاملات پر محیط یہ کہانی یقیناً یادگار ثابت ہوگی۔

لہو کے تاجروں کی سفاکی اور سیاہ کاریوں کا لرزہ خیز ماجرا

شہناز ایک جھٹکے سے بیدار ہوئی۔ اس نے اندھیرے میں کلاک کی چمک دار سوئیوں کی طرف دیکھا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ تقریباً ایک گھنٹا سوتی رہی ہے۔ اپارٹمنٹ میں اندھیرا تھا۔ روشنی کی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر ٹٹولا۔ بالآخر اسے ریڈیو مل گیا۔ وہ بٹن دبانے ہی والی تھی کہ رک گئی۔ اب بابر کو کال کرتی تو اسے یہ اعتراف بھی کرنا پڑتا کہ اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور بابر اس کوتاہی پر یقیناً ناراض ہوتا۔ کیوں خواہ مخواہ مصیبت مول لی جائے۔ بہتر یہ ہے کہ بابر کی کال کا انتظار کیا جائے اور اگر بابر نے کہا کہ اس نے پہلے بھی کال کیا تھا تو وہ کہہ دے گی کہ ٹرانسمیشن اس تک نہیں پہنچا تھا۔ ممکن ہے، بابر شک کرے کہ وہ سو گئی تھی لیکن وہ یہ ثابت تو نہیں کر سکتا۔

وہ کھڑکی کی طرف گئی اور تاریکی میں کرسی پر جا بیٹھی۔ بابر نے ٹھیک کہا تھا۔ پولیس بلڈنگ میں آئی تھی اور پوری عمارت خالی کرالی گئی تھی۔ انہوں نے اپارٹمنٹ کے دروازے پر دستک دی تھی لیکن شہناز سانس روکے بیٹھی رہی تھی۔ کسی نے لٹو گھما کر دروازہ کھولنے کی بھی کوشش کی تھی اور شہناز کے اعصاب جواب دینے لگے تھے۔ اس نے دروازہ تو لاک کر دیا تھا مگر اسے ڈر تھا کہ ممکن ہے، انہوں نے بلڈنگ کے منیجر سے ڈپلی کیٹ چابی لے لی ہو۔ بالآخر اسے جاتے ہوئے قدموں کی دور ہوتی ہوئی آہٹ سنائی دی اور اس نے سکون کی سانس لی تھی مگر وہ پوری طرح پُرسکون ایک گھنٹے بعد ہو سکی تھی۔

پھر اسکول کی عمارت اندھیرے میں ڈوب گئی تھی۔ اس کے باوجود وہ کھڑکی سے دور ہی رہی تھی۔ اس کے بعد وہ کھڑکی کے پاس گئی تو تھی لیکن اسے لگتا تھا کہ نامعلوم نگاہیں اب بھی اس

اپارٹمنٹ بلڈنگ کا جائزہ لے رہی ہیں۔ جیسے پولیس نے اسے کھڑکی میں دیکھ لیا ہے اور اب اسے چیک کرنے کے لیے آرہے ہیں کہ وہ بلڈنگ خالی کرائے جانے کے باوجود اس اپارٹمنٹ میں کیوں موجود ہے۔ چنانچہ اس کے کان آہٹوں کے خوف سے دروازے پر لگے رہے لیکن ہوا کچھ بھی نہیں۔

اس نے کرسی پر بیٹھ کر سامنے دیکھا۔ نائٹ اسکوپ اس کی گود میں رکھا تھا۔ چند گھنٹے بعد سورج طلوع ہونا تھا۔ شام کو پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ غروب آفتاب کا منظر کس قدر خوب صورت ہوتا ہے لیکن وہ منظر دیکھنے کے لیے کھڑکی کے قریب جانے کی اسے ہمت نہیں ہوئی تھی اور پھر سورج غروب ہونے کے بعد اندھیرا بھی بہت تیزی سے چھایا تھا۔ اس کے بعد سناٹا بھی ہوگیا تھا۔ تنہائی میں وہ سناٹا بہت خوفناک اور اعصاب شکن محسوس ہو رہا تھا۔

اب اس وقت وہ سناٹا اور مہیب ہوگیا تھا۔ وہ بابر کو کال کرنا چاہتی تھی۔ تنہائی کے احساس کو دور کرنے کی یہی ایک صورت تھی۔ کیونکہ یہاں تو تنہائی کے ڈراؤنے احساس سے نکالنے کے لیے کوئی آواز بھی نہیں تھی۔ دوسری طرف اسکول میں بھی سناٹا تھا۔ حد یہ کہ اسکول کے اسٹیڈیم میں بھی اندھیرا اور سناٹا تھا۔ بس اسکوربورڈ والے کیبن میں مدھم سی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

اچانک اسے ایک شک نے گھیر لیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے سونے کے دوران کچھ ہوا ہے۔ کوئی بات ہوئی ہے لیکن وہ اسے سمجھ نہیں پارہی تھی۔ ہاں..... کلاس روم میں اُس وقت روشنی ہو رہی تھی مگر اب وہاں اندھیرا تھا۔ اسٹیڈیم میں بھی ایک گھنٹا پہلے روشنی تھی مگر اب وہ بھی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ بے چین ہوگئی۔ اس کی انگلیوں نے گود میں رکھے نائٹ اسکوپ کو سہلا لیا۔ وہ اسے استعمال کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اگرچہ نیچے کے گھپ اندھیرے میں اس کے لیے تسلی اور سکون کا کوئی سامان نہیں تھا لیکن وہ نائٹ اسکوپ میں نظر آنے والے سرخ وسیاہ لرزیدہ عکس کے مقابلے میں پھر بھی لائق ترجیح تھا۔ نائٹ اسکوپ سے دیکھنا تو اسے ڈراؤنا خواب سا لگتا تھا۔ جیسے وہ کسی اجنبی سیارے میں جھانک رہی ہو۔ وہ خوف زدہ ہوجاتی تھی اس لیے بھی کہ وہ تنہا تھی لیکن شاید اس وقت اس کے ذہن میں یہ اُمید تھی کہ وہ کوئی ایسی بات دیکھے گی' جو بابر کو کال کرنے کا جواز بن جائے گی۔ کوئی بہانہ..... کوئی جواز!

پہلے اس نے نائٹ اسکوپ کی مدد سے اسٹیڈیم کا جائزہ لیا۔ پارکنگ لاٹ میں اسے ایک کار کے بونٹ سے حدت کی سرخ لہریں اٹھتی دکھائی دیں۔ کاریں تو وہاں تھیں لیکن کوئی آدمی اسے نظر نہیں آیا۔ نائٹ اسکوپ نے اسٹیڈیم سے اسکول کی عمارت کے علاقے کو ٹٹولا۔ اسے گھاس پر کم از کم ایک درجن سرخ شعلے لرزتے دکھائی دیے مگر وہ ان کے متعلق اندازہ نہ لگا سکی۔ بابر نے کہا تھا کہ نائٹ اسکوپ کسی بھی جسم یا کسی بھی شے سے اٹھنے والی حدت کی لہروں اور معمولی سی روشنی کو بھی پک کرلے گی۔ یہ درست تھا لیکن شہناز کے لیے کسی جسم یا کسی شے میں فرق کرنا مشکل تھا۔

اس نے اسکوپ کا رخ عمارت کی طرف کیا۔ وہ پارکنگ سے اسے عمارت کی چھت کی طرف گھماتی گئی۔

اچانک اس کے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ وہ آگے کی طرف جھک گئی۔ جو کچھ اسے نظر آرہا تھا' وہ اسے زیادہ غور سے دیکھنے کے لیے نگاہوں پر زور ڈالنے لگی۔ یہ اس کا وہم تو نہیں تھا۔ وہ مضطربانہ انداز میں کرسی سے اُٹھ گئی۔ اسکوپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ بیڈ کی طرف جھپٹی اور ریڈیو کو ٹٹولا۔ ریڈیو لے کر وہ پھر کھڑکی کے پاس آئی۔ اس نے جھٹکے سے ریڈیو کو آن کیا "بابر! بابر!" اس نے پکارا "وہ لوگ چھت پر چڑھے ہوئے ہیں۔ بابر..... بابر..... سُن رہے ہو تم؟"

●

کمال رشید کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ چھت پر کچھ لوگ موجود تھے اور وہ دبے پاؤں چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بایاں بازو بے جان ہونے کے باوجود وہ مضطربانہ انداز میں پھرتی سے اٹھا اور اس طرف جھپٹا جہاں طلبا جمع تھے۔ اس کا بے جان بازو ڈیسکوں سے ٹکراتا رہا مگر اس کے پاس اس طرف دھیان دینے کی فرصت نہیں تھی۔ "جاؤ..... نکلو یہاں سے" اس نے تند لہجے میں سرگوشی کی اور کلاس کے سب سے اچھے ایتھلیٹ بشیر کو کھڑکی کی طرف دھکیلا۔ اس نے اپنے داہنے ہاتھ سے بشیر کو سہارا دے کر کھڑکی پر چڑھنے میں مدد دی۔ پردے کی کٹی ہوئی ڈوری لٹک رہی تھی۔ بشیر نے اسے تھاما اور نیچے اترتا چلا گیا۔

"اب تم جاؤ گے رئیس" اس نے کہا۔

"نہیں سر۔ میں آپ کو اس حال میں چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔"

"بے وقوف مت بنو" کمال نے اسے ڈانٹا "تم اپنی اہمیت نہیں سمجھ رہے تمہاری اہمیت تو اب مجرموں پر بھی واضح ہوچکی ہے۔"

"کچھ بھی ہو سر!"

"میں کہتا ہوں' بحث مت کرو" کمال کے لیے اپنی آواز نیچی رکھنا دشوار ہو رہا تھا۔ "تم میری حکم عدولی کر رہے ہو....."

"آخری بار سر۔ وعدہ کرتا ہوں' اس کے بعد آپ کا ہر حکم مانوں گا۔"

"پاگل لڑکے' تمہاری یہاں موجودگی مجرموں کے لیے تقویت اور ہمارے لیے کمزوری کا سبب بنے گی۔ تمہیں میرا یہ حکم ماننا ہی ہوگا۔"

رئیس چند لمحے سوچتا رہا "ٹھیک ہے سر۔ میں مان لوں گا آپ کی بات لیکن آخر میں' کیونکہ یہاں ان لوگوں کو اُترنے میں مدد دینے کے لیے بھی کسی کی ضرورت ہے۔ آپ کی حالت ایسی نہیں کہ آپ زیادہ دیر یہ کام کرسکیں۔"

کمال کو اندازہ ہوگیا کہ بحث کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس وقت ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

کپڑے کی رسی کھنچی تو اندازہ ہوگیا کہ بشیر نیچے پہنچ چکا ہے "تو اب کون جائے گا؟" کمال نے پوچھا۔

"اب اشفاق جائے گا" رئیس نے کہا پھر وہ اشفاق کو سہارا دینے لگا۔

کلاس میں لڑکیوں کی تعداد آٹھ تھی۔ انہیں اُتارنا سب سے دشوار مرحلہ تھا پھر لڑکیوں میں ہمت بھی نہیں تھی۔ وہ رونے لگی تھیں۔ رئیس کی تجویز پر کپڑے کی ایک اور رسی لٹکا دی گئی۔ اس کے بعد ہر لڑکی کے ساتھ رئیس خود گیا۔ تاکہ بوقتِ ضرورت خوف زدہ لڑکی کو گرنے سے بچا سکے۔ ساتویں لڑکی کو نیچے پہنچا کر واپس آیا تو اس نے نازیہ کی طرف دیکھا۔

"یہ تو اس قابل نہیں کہ جا سکے" صوفیہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ نعمان اب تم جاؤ" رئیس نے کہا۔

کلاس آہستہ آہستہ خالی ہو رہی تھی۔

○☆○

بابر ہڑبڑا کر اُٹھا اور اس نے ریڈیو پر چلا کر پوچھا "کتنے ہیں وہ؟"

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتی" ریڈیو پر شہناز کا جواب ملا "چار ہیں یا پانچ ہیں۔ میں ٹھیک طرح سے دیکھ نہیں پا رہی ہوں۔"

"دیکھو... غور سے دیکھو۔ مجھے صحیح تعداد بتاؤ۔"

"پانچ... ہاں، مجھے پانچ افراد نظر آ رہے ہیں۔"

"وہ ہیں کہاں؟"

"عمارت کے عقبی حصے میں... اس جگہ سے قریب، جہاں تم ہو۔"

"وہ کیا کر رہے ہیں؟"

"میرا خیال ہے، ان میں سے ایک اس طرف اُتر رہا ہے۔ بابر.... عمارت کے گرد سرخ دھبے جابجا نظر آ رہے ہیں۔ میں کیا کروں؟"

"بس تم دیکھتی رہو، اس طرف۔ ضرورت پڑی تو میں تمہیں پھر کال کروں گا۔"

پھر وہ نذیر کا ہاتھ تھام کر اسے کھینچتا ہوا باہر لایا۔ ساتھ ہی وہ چیخ چیخ کر شکور اور شہلا کو بھی پکار رہا تھا۔ وہ چاروں بدقسمت کلاس روم کے باہر اکٹھا ہوئے "سنو... وہ اندر گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں" بابر نے ہذیانی لہجے میں کہا "وہ اس طرف عقبی حصے میں ہیں۔ وہ اسٹور روم کی طرف گھسنے کی حماقت نہیں کریں گے" اس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ خوف زدہ ہے لیکن اس کے پاس خود پر قابو پانے کی مہلت نہیں تھی۔ پہلی بار اس کا موت سے سامنا ہوا تھا۔ اب اسے پتا چل رہا تھا کہ نہتے اور بے بس لوگوں پر ظلم کرنا اور قوت کا سامنا کرنا دو مختلف باتیں ہیں "وہ تین

کسی مغربی ملک میں ایک خاتون، بچے کو ساتھ لے کر ایک ڈیپارٹمنٹ اسٹور میں شاپنگ کرنے گئی۔ بچہ بہت شرارتی تھا اور ماں کو اس قدر تنگ کر رہا تھا کہ اس کے لئے خریداری کرنا مشکل ہوگیا۔ اس نے منیجر سے کہا کہ چونکہ یہ بہت شرارتیں کر رہا ہے اور میرے لئے شاپنگ کرنا ممکن نہیں اس لئے میں جا رہی ہوں۔ منیجر موٹی اسامی کو جاتا دیکھ کر پریشان ہوا، تاہم اس نے کہا "آپ واپس نہ جائیں، ہمارے پاس بچوں کی نفسیات کا ایک ماہر موجود ہے۔ ہم اس سے مسئلے کا حل دریافت کرتے ہیں۔"

ماہر نفسیات کو بلا کر ساری صورت حال بیان کی گئی۔ اس نے بچے کو قریب بلا کر اس کے کان میں کچھ کہا جس کے بعد بچہ چپ چاپ ایک جگہ پر بیٹھ گیا۔ خاتون نے اطمینان سے دو تین گھنٹے شاپنگ کی اور بچے کو ساتھ لے کر چلی گئی۔ دُکان سے باہر آ کر اس نے بچے سے پوچھا "اس آدمی نے تم سے کیا کہا تھا جسے سن کر تم یوں چپ چاپ بیٹھ گئے؟"

بچے نے کہا "اس نے کہا تھا کہ اگر اپنی جگہ سے ذرا بھی ہلے تو تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

عطاء الحق قاسمی کے سوانحی انٹرویو

"یہ نصف صدی کا قصہ ہے" سے ایک اقتباس

★ ✷ ★

کلاس روم اور دو باتھ روم کی عقبی کھڑکیوں سے اندر آ سکتے ہیں" اس نے مزید کہا "نذیر.... تمہیں کونے والے زینے اور اس کے سامنے والے کلاس روم پر نظر رکھنی ہے۔ سیڑھیوں پر معمولی آہٹ سنتے ہی میں بم اُڑا دوں گا۔ میں درمیانی زینے پر نظر رکھوں گا اور ہاں.... اپنے اپنے بم اس کلاس روم کے باہر ڈھیر کر دو۔ ہم ختم بھی ہوگئے تو کیا! بچوں کو مار کر ہی مریں گے۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا اور درمیانی زینوں کی طرف بھاگا۔

نذیر نے برآمدے کی لائٹ آف کی اور باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے بڑی احتیاط اور آہستگی سے باتھ روم کا دروازہ کھولا اور شٹر لگا دیا پھر وہ پیچھے ہٹا اور گھٹنوں کے بل جھک کر پوزیشن سنبھال لی۔ یہاں سے وہ باتھ روم کی عقبی کھڑکی پر نظر رکھ سکتا تھا۔ شکور نے برابر والے کمرے کے سامنے پوزیشن سنبھال لی تھی۔ شہلا اور بابر نے راہداری کے تمام کمروں کے دروازے کھول دیے

تھے۔ عمارت میں خاموشی چھاگئی تھی۔ بس بد قسمت کلاس روم کی طرف سے عجیب سی آواز آرہی تھی۔ قدموں کے اِدھر اُدھر ہونے کی آواز...... اور جیسے کوئی چیز کسی دوسری چیز سے رگڑ کھارہی ہو۔ نذیر سوچ میں پڑگیا کہ کلاس میں نہ جانے کیا ہورہا ہے۔ اس کا اب بھی یہی خیال تھا کہ کلاس روم میں کوئی گڑبڑ ہورہی ہے۔ اسی وقت ایک اور آواز نے اسے چونکا دیا۔ راہداری کی مدھم روشنی میں اس نے گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے مشکور کو شاٹ گن فائرنگ پوزیشن میں لاتے دیکھا۔ اگلے ہی لمحے شاٹ گن گرجی اور نذیر کے جسم میں سرد لہری دوڑ گئی۔ وہ اُچھل کر کھڑا ہوا اور مشکور کی طرف لپکا۔

مشکور نے شاٹ گن سے شیل نکالا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "کھڑکی سے اندر آنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے اسے اُڑادیا۔"

نذیر نے بھی رائفل تان لی۔ وہ اپنی جگہ واپس چلا آیا تھا۔ کلاس روم کی طرف سے پھر وہی تشویش میں مبتلا کرنے والی آواز آئی پھر ایک اور آواز سُنائی دی۔ وہ تیسرے کلاس روم کی طرف لپکا۔ اسی وقت اس نے کلاس روم کی کھڑکی سے کسی کو جسم لٹکا کر اندر آنے کی کوشش کرتے دیکھا پھر کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا اور وہ انسانی جسم اندر آگرا۔ نذیر نے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ گولیاں اس شخص کے جسم سے ٹکرائیں تو عجیب سی آواز نکلی تھی اور وہ پیچھے کی طرف گرا تھا۔ اس آواز کو سُن کر نذیر کے ذہن میں ایک خیال آیا لیکن صورتِ حال کی سنگینی کی وجہ سے اس کا شعور اسے گرفت میں نہیں لے سکا۔ اس وقت ایک اور جسم فرش پر گرا۔ نذیر نے اس پر بھی فائر کیا۔ وہ تیسرے پر فائر کرنے ہی والا تھا کہ شاٹ گن گرجی اور تیسرا شخص کھڑکی سے نیچے زمین کی طرف گرتا گیا۔ مشکور بھی اس کی طرف آگیا تھا۔

مشکور نے شاٹ گن سے تین فائر کیے۔ پھر وہ کمرے میں گھس گیا۔ نذیر وہ منظر ہی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شاٹ گن کا فائر آدمی کا کتنا بُرا حشر کرتا ہے۔

اندر سے مشکور نے کہا "کم بخت بلٹ پروف پہنے ہوئے ہیں۔ یہ اب بھی زندہ ہیں۔ آؤ..... انہیں کھڑکی سے باہر پھینکنے میں میری مدد کرو۔"

"کھڑکی سے دور رہو۔ ممکن ہے اور بھی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں یہ کام خود ہی کرلوں گا۔"

نذیر دیکھتا رہا۔ مشکور نے زخمی پولیس والوں کو غیر مسلح کیا پھر اس نے ایک کو بازوؤں میں اٹھایا اور کھڑکی تک لے گیا۔ اس کی سانس پھول گئی تھی۔ زخمی پولیس والا کراہ رہا تھا۔ مدھم روشنی میں بھی نذیر دیکھ سکتا تھا کہ شاٹ گن کا بلاسٹ زیادہ تر اس کی بلٹ پروف سے ٹکرایا تھا مگر گولیوں کی بوچھاڑ اس کی کھلی گردن اور اس کے ہیلمٹ سے بھی ٹکرائی تھی۔ وائزر کا شیشہ بھی ٹوٹا تھا۔ اس کا چہرہ اور گردن خون میں نہاگئی تھی۔ مشکور نے اسے اُٹھاکر ٹوٹے ہوئے شیشے کے خلا سے باہر دھکیلا اور چھوڑ دیا۔ دوسرے پولیس والے نے مزاحمت کی۔ بلکہ ایک مرحلے پر تو اس نے مشکور کو دھکیل کر گرا بھی دیا تھا لیکن بالآخر مشکور نے اسے بھی اٹھاکر کھڑکی سے باہر پھینک دیا تھا۔

اس لمحے جمنازیم کی چھت سے فائرنگ شروع ہوگئی۔ نذیر اور مشکور نیچے جھک گئے۔ انہوں نے بھی فائرنگ شروع کردی۔ اچھی خاصی جنگ ہورہی تھی۔ مسلسل روشنی کرنے والے شیل چھوڑے جارہے تھے۔ نذیر اور مشکور پیٹ کے بل گھسٹتے ہوئے کمرے سے نکل آئے۔ باہر وہ دونوں دیوار سے ٹیک لگاکر کھڑے ہوگئے۔

"اب ہم کیا کریں؟" نذیر نے چیخ کر بابر سے پوچھا جو راہداری کے درمیانی حصے میں زینے پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

"انتظار کرو۔"

"لیکن کس کا؟"

"ان کے آئندہ لائحۂ عمل کا۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ کس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔"

فائرنگ جاری رہی۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹتے رہے۔ کبھی کوئی بھٹکی ہوئی گولی کمرے یا باتھ روم سے ہوکر کھلے دروازے سے راہداری میں بھی آجاتی تھی۔ وہ لوگ دیوار سے ٹیک لگائے ساکت کھڑے تھے۔ اس ڈر سے کہ کوئی آوارہ گولی انہیں ہی نہ چاٹ جائے۔ نذیر کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ پولیس اس طرح فائرنگ کرکے یرغمالیوں کو کیوں خطرے میں ڈال رہی ہے۔

فائرنگ بتدریج کم ہونے لگی۔ بالآخر تھم گئی۔

"یہ لوگ کیا کررہے ہیں؟" نذیر نے چیخ کر بابر سے پوچھا۔

"یہ جاننا اتنا ضروری ہے تو باہر جاکر ان سے خود پوچھ لو" بابر نے تپ کر کہا "لیکن، اس صورت میں تمہارا سر کندھوں پر نہیں رہے گا۔"

"غصہ کیوں کررہے ہو؟"

"میں کیا بتاسکتا ہوں، کیا میں ان سے ملا ہوا ہوں...... اور اندازہ میں لگاسکتا ہوں تو تم بھی لگاسکتے ہو۔"

"تمہارا اندازہ کیا ہے؟"

"میرا خیال ہے، ایک پولیس والا چھت پر پھنسا رہ گیا تھا۔ وہ اسے عافیت سے اُتارنے کے لیے فائرنگ کررہے تھے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، وہ مزید کارروائی کریں گے؟" نذیر نے پوچھا۔

"وہ میری توقع سے زیادہ بے وقوف ثابت ہوئے ہیں لیکن میں نہیں سمجھتا کہ وہ دوبارہ حماقت کریں گے۔ اب وہ بیٹھ کر ہمارے ردِعمل کے متعلق اندازے لگائیں گے اور پسینے میں نہائیں گے۔"

"تم انہیں کال کرکے دھمکاتے کیوں نہیں؟"

"ابھی نہیں۔ ابھی تو میں فیکلٹی روم جا کر شہناز سے پوچھوں گا کہ کیا صورتِ حال ہے۔"

بابر راہداری میں جھک کر چل رہا تھا۔ فیکلٹی روم میں ریڈیو موجود نہ ہوتا تو اس وقت وہ ہرگز یہ رسک نہ لیتا۔ وہ بہت پریشان تھا۔ یہ حقیقت اسے خوف زدہ کررہی تھی کہ پولیس نے ایک نہایت قابلِ عمل منصوبہ بنایا بھی تھا اور اس پر اس طرح عمل بھی کیا تھا کہ کامیاب ہوسکتے تھے۔ اگر ریڈیو پر شہناز سے رابطہ نہ ہوتا تو پولیس یقیناً کامیاب ہو جاتی...... اور اسے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ وقت پڑنے پر وہ اتنا خوف زدہ بھی ہو سکتا ہے اور اس کے ساتھی عضوِ معطل بھی ہوسکتے ہیں۔ گولیوں کی برسات ہوئی تو ان میں سے کسی کو یرغمالی یاد بھی نہیں رہے۔ وہ سب کچھ بھول گئے۔ اگر پولیس اندر آنے میں کامیاب ہوجاتی تو نہ جانے کیا انجام ہوتا اور اسے شہناز سے بھی باز پرس کرنا تھی۔ اس کی نظروں میں آئے بغیر وہ لوگ چھت پر پہنچے کیسے۔ شہناز کو بالکل آخر میں علم کیوں ہوا۔ اس بار تو قسمت نے ان کا ساتھ دیا تھا لیکن قسمت ہمیشہ تو کسی کا بھی ساتھ نہیں دیتی۔

کمرے کے باہر سے ہی اسے سسکیاں سُنائی دیں۔ سسکیوں میں اس کا ہی نام پکارا جارہا تھا۔ اس نے لپک کر ریڈیو اُٹھایا "خاموش ہوجاؤ شہناز۔ ہم سب خیریت سے ہیں" اس نے کہا۔

"میں دس منٹ سے چیخ چیخ کر تمہیں پکار رہی ہوں۔"

"فائرنگ کے شور میں یہاں کان پڑی آواز بھی نہیں سُنائی دے رہی تھی۔"

"بابر.... بچے.... میرا مطلب ہے تمہارے یرغمالی طلبا..."

"کیا ہوا طلبا کو؟"

"وہ.... وہ باہر نکل رہے ہیں۔"

بابر نے ریڈیو صوفے پر پٹخا اور تیر کی طرح کمرے سے نکلا۔ اس کے اوسان خطا ہوگئے۔ یرغمالی ہی تو ان کے تحفظ کی ضمانت تھے۔ وہ ہاتھ سے نکل گئے تو ان کے لیے موت کے سوا کچھ بھی نہیں رہے گا۔ اس بار راہداری میں بھاگتے ہوئے اسے گولیوں کا بھی خوف نہیں تھا۔ اس نے پوری قوت سے کلاس روم کا دروازہ کھولا۔ لائٹ آن کرتے ہی اسے زبردست شاک لگا۔ جو کمرا کچھ دیر پہلے طلبا سے بھرا ہوا تھا، اب تقریباً خالی ہوچکا تھا۔ وہ خاموش کھڑا کمال، صوفیہ اور رئیس کو دیکھتا رہا، جو اپنا کام کرتے کرتے اچانک جم کر رہ گئے تھے۔ روشنی نے انہیں حیران کردیا تھا۔ نازیہ ایک گوشے میں سمٹی ہوئی بیٹھی تھی، جیسے اسے گردوپیش سے نہ کوئی غرض ہو نہ ہوش۔ بابر خونخوار نظروں سے اس شخص کو دیکھتا رہا، جس کے بارے میں اس سے اندازے کی بدترین غلطی سرزد ہوئی تھی۔ وہ اس کے زخمی چہرے کو بغور دیکھتا رہا۔ کیوں.... آخر اس سے اندازے کی یہ غلطی کیوں سرزد ہوئی۔ وہ اسے یوں دیکھ رہا تھا، جیسے اس ٹوٹے پھوٹے چہرے پر اسے اپنے سوال کا جواب لکھا مل جائے گا لیکن وہاں تو ان روشن اور ضدی آنکھوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

کمال نے پلٹ کر کھڑکی سے جھانکا اور بولا "جلدی کرو لڑکو۔ تھوڑا سا وقت ہے تمہارے پاس۔"

بابر سے بولا بھی نہیں جارہا تھا۔ اس نے گھُٹی گھُٹی آواز میں کہا "تم سمجھ رہے ہو کہ فتح یاب ہوگئے ہو لیکن ایسا نہیں ہے۔ تم سب تو نہیں نکل سکے نا۔ ہمارا مقصد اب بھی پورا ہوجائے گا۔"

"ہار جیت کی فکر تمہیں ہوگی۔ میرے لیے یہ کوئی کھیل نہیں تھا" کمال نے کہا "مجھے رہ جانے والوں کے متعلق افسوس ہے لیکن میں نے تم سے چوبیس انسانی کھلونے تو چھین لیے۔ ان میں ایس پی جلیس کا بیٹا بھی تھا۔"

بابر بھنا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اب کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ اس نے شاٹ گن کا رخ کمال کے چہرے کی طرف کردیا۔ وہ اس بیماری کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنا چاہتا تھا، جو اس کے مکمل اور بے داغ منصوبے کو تقریباً موت سے ہم کنار کرچکی تھی۔ وہ ایک لمحے کو رُکا۔ اسے افسوس تھا کہ وہ اسے توڑ نہیں سکا۔ اس کا اسے پوری طرح موقع نہیں ملا تھا لیکن اس شخص کو سزا دینا ضروری تھا۔ وہ شاٹ گن کا رخ اس کی طرف کیے آگے بڑھا۔ وہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ کوئی ردِعمل.... خوف کی کوئی علامت... کچھ بھی نہیں! وہ غصے اور بے بسی کی آگ میں جھلس رہا تھا۔

خیر۔ اب اسے بھی کوئی پروا نہیں۔ اس نے گن کو کندھے پر ٹکایا اور ٹریگر پر انگلی رکھ کر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ اس نے نذیر کو کمرے میں داخل ہوتے اور خود پر چھلانگ لگاتے نہیں دیکھا۔ بس اسے اتنا احساس تھا کہ فائر کے وقت کمال رشید کا چہرہ شاٹ گن کی نال کے سامنے نہیں تھا۔ وہ فرش پر گرا۔ اس وقت وہ غصے کا آتش فشاں بن چکا تھا۔

○☆○

ایس پی جلیس فون پر ہوم سیکریٹری سے جھاڑ سُن چکا تھا۔ یہ اسے اب پتا چلا تھا کہ وزیراعظم نے واردات کی خبر ملتے ہی ٹی وی پر اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ حکومت دہشت گردوں کے مطالبات تسلیم کرکے دہشت گردی کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گی لیکن آٹھ گھنٹے بعد انہوں نے بیان دیا کہ انسانی جانوں کو خطرے سے بچانا زیادہ ضروری ہے۔ لہٰذا دہشت گردوں سے سمجھوتا کرنا پڑے گا۔ دوسری طرف وزیرِ داخلہ اپنا غیر ملکی دورہ مختصر کرکے واپس آچکے تھے اور کسی بھی وقت مری پہنچنے والے تھے۔

اور اب تھکے ہارے مضمحل جلیس احمد کو روشنیوں، کیمروں اور صحافیوں کا سامنا کرنا تھا۔ وہ کیمرے سے نظریں چرا رہا تھا۔ پریس کانفرنس سے وہ ویسے بھی گھبراتا تھا اور پھر یہ پریس کانفرنس تو تھی بھی خوفناک۔ وہ تو صحافیوں کو ٹال دیتا مگر اوپر کے احکامات تھے کہ اسے صحافیوں کا سامنا کرنا ہے۔

اب یہ محض پولیس ایکشن نہیں رہا تھا۔ بلکہ ایک بڑے سیاسی کھیل میں تبدیل ہوچکا تھا۔ اس سطح پر وہ بہت چھوٹا آدمی تھا۔ اسے جو لائن دی گئی تھی۔ اسے اس کے مطابق بولنا تھا۔ دوسری طرف یہ بھی بعید از امکان نہیں تھا کہ گورنمنٹ کے حامی صحافیوں کو سوالات کے سلسلے میں بھی کوئی لائن دی گئی ہو۔

مائیکروفون اسٹیڈیم کے ایک اسٹینڈ میں سیٹ کیا گیا تھا۔ اس نے پریس کانفرنس کا آغاز کیا "آپ لوگ جانتے ہیں کہ کل دوپہر ایک بجے چار دہشت گرد اسکول میں داخل ہوئے۔ انہوں نے فائر الارم بجاکر اسکول کو خالی کرالیا۔ اس سے پہلے وہ ٹاپ فلور کے ایک کلاس روم پر قابض ہوچکے تھے۔ اس کلاس میں موجود طلبا اور دو ٹیچرز کو انہوں نے یرغمال بنالیا۔ ابھی ہم یہ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ دہشت گردوں کے سیاسی مقاصد بھی ہیں یا نہیں۔ ہم اتنا جانتے ہیں کہ انہوں نے بھاری زرِ تاوان کا مطالبہ کیا ہے۔ ہمارا مفروضہ ہے کہ ان کا مقصد صرف زرِ تاوان کا حصول ہے۔ آج صبح دو بجے ہم نے ایک کارروائی کی' جس کا مقصد دہشت گردوں پر قابو پانا اور یرغمالیوں کو آزاد کرانا تھا۔ یہ کارروائی جزوی طور پر کامیاب رہی۔ تین طلبا اور دو ٹیچرز کے سوا تمام یرغمالی ہماری فائرنگ کے دوران عمارت سے بخیروعافیت نکل آئے۔ ہم تیسری منزل تک پہنچنے میں تو کامیاب ہوگئے تھے لیکن اس پر قبضہ نہ کرسکے۔ ہمیں پسپا ہونا پڑا۔ میں اس بات پر زور دوں گا کہ صورتِ حال اب بھی بے حد تشویش ناک ہے۔ دہشت گرد ہر طرح کے اسلحے سے لیس ہیں اور ان کے قبضے میں پانچ یرغمالی بھی ہیں۔ شکریہ۔"

اس کا بس چلتا تو اب اپنے آپریشن بوتھ کی پناہ گاہ کا رُخ کرتا لیکن ابھی اسے اس دشوار مرحلے سے بھی گزرنا تھا۔ اسے سوالوں کے جواب دینا تھے۔ وہ سر جھکائے سوال کا منتظر تھا۔

"اس کارروائی میں جانی نقصان کتنا ہوا؟"

"دو جوان جاں بحق اور دو زخمی ہوئے۔"

"اور ویسے اب تک کتنا نقصان ہوا ہے؟"

"تین افراد جاں بہ حق ہوئے اور دو زخمی۔" پھر اس نے وضاحت کی۔ "صبح دہشت گردوں کے ہاتھوں ایک ٹیچر ہلاک ہوا تھا۔ باقی نقصان پولیس کے جوانوں کا ہوا ہے۔"

"بس؟"

"باہر آنے والے طلبا نے بتایا ہے کہ اندر بھی ایک ٹیچر زخمی ہے۔"

"زخمیوں کا کیا حال ہے؟"

"پولیس کے دونوں جوانوں کی حالت تشویش ناک ہے۔ البتہ اسکول میں جو ٹیچر زخمی ہے' اس کی حالت اتنی خراب نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ اس نے طلبا کو اسکول سے نکلنے میں مدد دی ہے۔ بہرحال زخمی وہ ہے۔ اس کے گولی لگی تھی۔"

"آپ نے عمارت پر قبضہ کرنے کی کارروائی کیوں کی۔ جبکہ آپ جانتے تھے کہ اس سے یرغمالیوں کی جانیں خطرے میں پڑ سکتی ہیں؟" ایک صحافی نے سوال کیا۔

جلیس نے جان لیا کہ اب سخت مرحلہ شروع ہو رہا ہے "یہ میرا انفرادی فیصلہ تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ کارروائی کا اچانک پن دہشت گردوں کو حیران کردے گا اور ہم کامیاب ہوجائیں گے۔"

"لیکن آپ کا منصوبہ ناکام ہوگیا۔"

"اس کا جواب ہاں بھی ہے اور نہیں بھی۔ ہم نے دہشت گردوں کی بے خبری میں پوزیشنیں سنبھال لی تھیں۔ انہیں بالکل آخری لمحوں میں پتا چلا۔ اس اندازے کی تصدیق بچ نکلنے والے طلبا نے کی ہے۔ انہیں چھت پر چڑھنے والے جوانوں کی آہٹیں سُنائی دے گئی تھیں۔ بس پھر انہوں نے اپنا دفاع منظم کرلیا۔"

"انہیں آپ کے آدمیوں کی بلڈنگ میں موجودگی کا شبہ کب ہوا؟"

"حملے سے چند لمحے پہلے۔ انہوں نے لائٹیں آف کردی تھیں۔ اس سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ انہیں شک ضرور ہوگیا ہے۔"

"تو پھر آپ نے کارروائی روکی کیوں نہیں۔"

"میں نے یہ حکم دیا تھا..."

"تو پھر کیا ہوا...؟"

"اسکول کی چھت پر پہنچنے والے گروپ کے لیڈر کا واکی ٹاکی جمنازیم کی چھت پر رہ گیا تھا۔ رابطہ ممکن نہیں رہا تھا۔"

"حملے میں کوئی دہشت گرد بھی زخمی ہوا؟"

"اس کا ہمیں علم نہیں۔"

"آپ لوگوں نے اتنی فائرنگ کی۔ آپ کو یہ خوف نہیں تھا کہ اس سے کوئی لڑکا بھی زخمی ہوسکتا ہے۔"

اس طرح کے ناقدانہ سوالات جلیس کے لیے پریشان کُن تھے۔ اس نے کہا "ہم نے اسکول کی چھت پر پھنسے ہوئے اپنے ایک آدمی کو کور دینے کے لیے فائرنگ کی تھی۔ ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ طلبا فرار ہو رہے ہیں۔ انہیں بھی زیادہ سے زیادہ موقع فراہم کرنا تھا۔ دوسرے کلاس روم کی پوزیشن ایسی ہے کہ ہمیں یقین تھا کہ کوئی بھٹکی ہوئی گولی بھی اس طرف نہیں جائے گی۔"

"آپ کو معلوم ہے کہ دہشت گرد کون ہیں؟"

"بچ نکلنے والے طلبا سے ہمیں تین نام معلوم ہوئے ہیں لیکن اس سے زیادہ ابھی تک کچھ اور معلوم نہیں ہوسکا ہے۔"

"ان کے نام بتائیں گے؟"

"فی الوقت تو یہ ممکن نہیں۔"

"کیا وہ مجرمانہ ریکارڈ رکھنے والے ہیں؟"

"کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ بہرحال یہ طے ہے کہ وہ خطرناک لوگ ہیں۔ جو کچھ سُنا ہے' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا لیڈر نہایت درجے کا اذیت رساں ہے۔ اس کے ایک ساتھی نے اسکول کے پا

ٹی انسٹرکٹرز کو شوٹ کر دیا یعنی ان کے نزدیک انسانی جانوں کی کوئی اہمیت نہیں" جلیس نے ایک لمحے توقف کیا پھر بولا "بس حضرات۔ فی الحال میں آپ کو اور کچھ نہیں بتا سکتا۔"

"بوتھے کے بارے میں آپ نے کچھ نہیں بتایا۔"

"اس کے بارے میں بس اتنا معلوم ہے کہ وہ عورت ہے۔"

"آپ کے خیال میں اس جرم کے سیاسی محرکات نہیں ہیں؟"

"میرے خیال میں اس کے لیے ایک ہی مناسب لفظ ہے۔ دہشت گردی" جلیس نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا "وہ یرغمالیوں کے ساتھ بے رحمانہ برتاؤ کر رہے ہیں۔ ہمیں یہ بھی پتا چلا ہے کہ انہوں نے ایک بچی کی آبروریزی کی ہے۔ میرے نزدیک وہ بدترین قسم کے مجرم ہیں' جو آسانی سے دولت مند بننا چاہتے ہیں۔ جن کے نزدیک انسان اور انسانیت کی کوئی وقعت نہیں۔ ان کا انداز بھی دہشت گردوں والا ہے اور رویّہ بھی۔ انہیں میں انسانی کیچڑ قرار دوں گا۔۔۔ غلیظ کیچڑ۔"

"ہمیں بچ نکلنے والے طلبا سے بات کرنے کا موقع کب ملے گا؟"

"ہم نے ان سے پوچھ گچھ کی ہے اور انہیں ان کے گھر بھیجا جا رہا ہے۔ یہ معاملہ نمٹنے کے بعد ہی آپ ان سے بات کر سکیں گے۔"

"اس وقت آپ کا دہشت گردوں سے رابطہ ہے؟"

"نہیں۔"

"گویا آپ کو نہیں معلوم کہ اس وقت عمارت میں کیا ہو رہا ہے؟"

"نہیں۔ میں نے کئی بار انٹرکام پر کال کیا لیکن وہ کال ریسیو نہیں کر رہے ہیں۔"

"اب آپ کیا کریں گے؟"

"انتظار" جلیس نے کہا۔ اب وہ سوالات سے بیزار ہو چکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس سلسلے کو فوری طور پر نہ روکا گیا تو یہ ختم ہی نہیں ہو گا "حضرات۔۔۔۔ باقی سوالوں کے جواب آپ کو شام کو ملیں گے۔"

"ایک اور سوال" ایک صحافی نے آگے آتے ہوئے کہا "کیا یہ سچ ہے کہ آپ کا اکلوتا بیٹا بھی یرغمالیوں میں شامل ہے؟"

اس کے فوراً بعد صحافیوں میں بڑبڑاہٹیں ابھریں۔ جلیس کو اُمید ہو چلی تھی کہ فی الحال یہ بات دب گئی ہے مگر ایسا نہیں تھا۔

"وہ یرغمالیوں میں شامل تھا" اس نے کہا اور حصار توڑ کر نکلنے لگا۔

"کیا آپ کی کارروائی کا محرک یہی حقیقت تھی؟"

جلیس پلٹا۔ اس نے ہجوم میں سوال کرنے والے کو تلاش کیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "ہرگز نہیں۔"

سوالات کی بوچھاڑ ہو گئی مگر وہ انہیں نظرانداز کر کے اپنے بوتھ کی طرف چل دیا۔ اسے غصہ آ رہا تھا۔ پولیس کو کتنا غلط سمجھا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اس کے دو جوان زندگی گنوا بیٹھے تھے لیکن ۴۴ انسانی جانیں بچا بھی تو لی گئی تھیں۔ ان میں اس کا بیٹا بھی تھا مگر اس نے اس کے لیے کوئی خصوصی کوشش نہیں کی تھی پھر اسے خیال آیا کہ وہ اس کریڈٹ کا مستحق نہیں۔ کریڈٹ تو اس ٹیچر کو جاتا ہے' جس نے بچّوں کو فرار کرایا۔ اگر وہ یہ قدم نہ اُٹھاتا تو کیا ہوتا؟ یہ وہ سوال تھا' جس کا وہ جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔

بوتھ میں داخل ہو کر وہ دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور گہری سانسیں لینے لگا۔

"سخت وقت گزار کر آئے ہو؟" پرنسپل جمیل الرحمان نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

جلیس نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ سگریٹ کے کش لے رہا تھا "اور سگریٹ ہو گی آپ کے پاس؟"

"ضرور۔ بلکہ کافی بھی لو۔ تھرموس میں موجود ہے۔"

"آپ گھر نہیں گئے؟"

"گیا تھا۔"

جلیس نے اس کی دی ہوئی سگریٹ سُلگائی "لیکن نیند نہیں آئی آپ کو؟"

"میں نے ریڈیو پر بچ نکلنے والے طلبا کے متعلق سُنا تھا۔"

"بیشتر نکل آئے' میرا خیال ہے' کمال صاحب نے جیسے ہی یہ بات سمجھی کہ ہم نے آپریشن شروع کر دیا ہے تو انہوں نے موقعے سے بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہوئے طلبا کو باہر دھکیل دیا۔"

"میرے ٹیچرز کی کیا کیفیت ہے؟" جمیل الرحمان نے پوچھا۔

"وہ دہشت گردوں کی نفرت کا نشانہ بن رہے ہیں۔"

"اوہ۔۔۔"

"اور طلبا نے جو کچھ بتایا ہے' اس کی روشنی میں لگتا ہے کہ کمال رشید اسٹیل کا بنا ہوا ہے۔ جو کچھ دہشت گرد اس کے ساتھ کر چکے ہیں۔ اس کے بعد اسے زندہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

"بہت زیادہ زخمی ہے وہ؟"

"جی ہاں اور اس کے باوجود اس نے کارنامہ انجام دیا ہے۔"

"وہ سابق فوجی ہے اور اسکول کے بہترین ٹیچروں میں سے ہے" جمیل الرحمان نے کہا "اور ان دنوں وہ بہت پریشان تھا۔"

"پریشانی میں تو وہ اب ہے" جلیس نے کہا "اور مجھے یقین نہیں ہے کہ ہم اسے بعافیت نکال سکیں گے۔ کل رات ہم نے مجرموں کو ڈرا دیا ہے۔ اب وہ عمارت میں زیادہ دیر نہیں رُکیں گے۔"

"تو پھر تم کیا کرو گے؟"

"سوچتے تو رہیں گے لیکن اب کچھ کر گزرنے کا امکان کم ہے۔ یرغمالی اب پوری طرح مجرموں کے رحم و کرم پر ہیں۔"

○☆○

بابر کھڑکی کے پاس کھڑا پردوں کی درزوں سے باہر اسٹیڈیم کو دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ نذیر دروازے کے پاس رائفل کو ریڈی پوزیشن میں لیے کھڑا تھا۔ وہ خوف زدہ تھا کہ کسی بھی وقت بابر گھومے گا' اس کی شاٹ گن گرجے گی اور اسے اس مداخلت کی سزا ملے گی۔ اس نے ماسٹر کی جان ایک بار بچائی تھی لیکن وہ دوبارہ یہ ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آئندہ ایسا ہوا تو بابر اسے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔

بدستور کھڑکی سے جھانکتے ہوئے بابر نے کہا "ان لوگوں کو فیکلٹی روم میں لے جاؤ۔ اب ہر لمحے انہیں نظروں کے سامنے رکھنا ہوگا۔"

وہ سب دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ اچانک بابر نے کہا "کمال رشید یہیں رکے گا۔"

نذیر دروازے پر ٹھٹکا۔ اس نے پلٹ کر بابر کو سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر وہ دوسروں کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ صوفیہ دروازے پر رکی "اسے کوئی تکلیف نہ پہنچانا۔"

بابر نے سر گھما کر اسے دیکھا اور غرایا "مشکور.... لے جاؤ اسے یہاں سے۔"

مشکور نے صوفیہ کو باہر دھکا دیا اور باہر جاتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

بابر اور کمال کچھ دیر ایک دوسرے کو گھورتے رہے پھر بابر بڑی ڈیسک کی طرف بڑھا اور آرام سے بیٹھ گیا۔ اس نے شاٹ گن ڈیسک پر رکھ دی اور بولا "بیٹھو مسٹر کمال۔"

کمال بہت کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ یہ پیشکش ایک نعمت تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

بابر کی انگلیاں چند لمحے شاٹ گن کے ٹریگر سے کھیلتی رہیں پھر اس نے کہا "میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی۔"

کمال نے اسٹوڈنٹ ڈیسک سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں "میرا خیال ہے' اب تمہاری نظروں میں' میں بزدل نہیں رہا ہوں گا۔"

"میں تمہیں اس سے زیادہ کریڈٹ دوں گا۔ تم حیران کر دینے والے آدمی ثابت ہوئے ہو۔ تم بیشتر عام لوگوں جیسے کمزور نہیں ہو لیکن کمزور بہرحال ہو ضرور۔"

"سب سے بڑی کمزوری موت کا خوف ہے" کمال نے سکون سے کہا "جس کا یہ خوف نکل جائے' وہ کمزور نہیں رہتا۔"

بابر کی انگلیاں بدستور ٹریگر سے کھیل رہی تھیں "تو تم یہ فلسفہ پڑھاتے ہو اپنی کلاس میں۔"

"نہیں۔ یہ چیزیں کلاس میں نہیں پڑھائی جا سکتیں۔ یہ تو آدمی خود اپنے اندر دریافت کرتا ہے۔ میں کلاس میں طلبا کی ذہانت کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ زندگی کی سچائیاں تو بعد کی چیز ہیں۔ ذہن کی صحیح تربیت کر دی جائے' اسے صیقل کر دیا جائے تو سچائیاں خود سمجھ میں آنے لگتی ہیں مگر مناسب وقت پر۔"

بابر کی انگلی ٹریگر پر جم گئی "میں تمہیں مارنے والا ہوں" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"ممکن ہے" کمال نے بے پروائی سے کہا۔

"اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی تمہیں میری بات پر یقین نہیں آتا۔"

"توقع تو مجھے یہی ہے لیکن تمہاری بات پر یقین نہ کرنے میں ہی میری بہتری ہے اور پھر میں ایمان رکھتا ہوں کہ زندگی اور موت خدا کے اختیار میں ہے۔"

میں اس معاملے کو ابھی' اسی وقت اور یہیں نمٹا دینا چاہتا ہوں لیکن میرے خیال میں ابھی تم پکے ہوئے پھل کی طرح نہیں ہو کہ تمہیں توڑ کر خوشی ہو۔ ابھی تو لگتا ہے کہ تم نے مجھ سے خوف زدہ ہونا بھی نہیں سیکھا۔"

"مجھے یاد ہے کہ تمہیں دوسروں کو ایذا پہنچا کر خوشی ہوتی ہے اور تمہیں ایذا دینے کے طریقے بھی آتے ہیں۔"

"میں جانتا تھا کہ تمہیں یہ بات یاد ہوگی۔"

کمال تھکے تھکے انداز میں ہنسنے لگا "یاد کیسے نہیں۔ یہ میرا بازو کا سوراخ بھولنے دے گا؟"

"مجھے خوشی ہے کہ ابھی تم میں زندہ دلی باقی ہے" بابر نے بے رحمی سے کہا "ویسے یہ تو بتاؤ کہ اس صورتِ حال میں تمہیں دلچسپی اور محظوظ ہونے کا کون سا پہلو نظر آتا ہے۔"

"میری ہنسی کا غلط مطلب نہ لو۔ مجھے یہ صورتِ حال دلچسپ نہیں لگتی۔ اگر یہ ساعت تمہاری حکمرانی کی ہے... اور اگر ایسی چند اور ساعتیں تمہیں ملتی ہیں تو انہیں اچھی طرح انجوائے کر لو کیونکہ وقت ایک سا بھی نہیں رہتا۔ کبھی نہ کبھی وقت کی زد پر تم بھی آؤ گے.... میرے نہ سہی' کسی اور کے ہاتھوں..."

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔ گویا تم سمجھ سکتے ہو کہ میرا کام کتنا مشکل ہے۔"

"اس اسکول میں یہ جنگ جیت لینا کوئی بڑی بات تو نہیں" کمال نے طنز کیا۔

"یہ تو محض نکتۂ آغاز ہے۔"

"کمزور لڑکوں کو خوف زدہ کر کے تمہیں کیا حاصل ہوگا؟"

"تمہیں میرے عزائم کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ میں تو اس ملک کو تباہ و برباد کرنے کے ارادے سے نکلا ہوں۔"

"لیکن کیوں؟"

"اس لیے کہ مجھے ایک ہی کام آتا ہے۔ میری فطرت میں ہی تخریب ہے اور پھر اس ہنر کے ذریعے میں دولت بھی کما سکتا ہوں۔ پانچ کروڑ روپے کم تو نہیں ہوتے" بابر نے چند لمحے توقف کیا پھر بولا "ایک بات بتاؤ۔ تم مجھے روکنے کے لیے کیا کرو گے؟"

"میں تمہیں کیا روکوں گا۔ یہ سوال تم باہر والوں سے پوچھو"

کمال نے اسٹیڈیم کی جانب کھلنے والی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔
"ان کے لیے میرے پاس حیرتیں ہی حیرتیں ہیں۔"
"ویسے مسٹر بابر' اپنے اور میرے معاملے میں یہ اُمید نہ رکھنا کہ میں خاموشی سے لڑھک کر مرجاؤں گا۔ کاش نوبت یہاں تک نہ پہنچے۔ ورنہ تم سے جنگ میں مجھے بھی تم جیسا بننا پڑے گا اور یہ بات سوچ کر ہی میرا جی متلانے لگتا ہے۔ میں اور تم جیسا....."
بابر اُٹھ کر اس کی طرف بڑھا۔ "یہی تو تمہاری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ دہشت گردی سے لڑنے کے لیے دہشت گردی ضروری ہے اور تم دہشت گرد نہیں بن سکتے" وہ اس کے سامنے رُک گیا "ہمارے درمیان خوش گوار گفتگو رہی مگر اب ہمیں دوسروں کی طرف چلنا چاہیے۔"
کمال ڈیسک پر ہاتھ ٹکا کر اٹھنے لگا۔
"لیکن اس سے پہلے میں ایک تبصرہ کرنا چاہتا ہوں..... عملی تبصرہ" بابر نے کہا اور کمال کے حلق پر شاٹ گن کی ہیل ماری۔ کمال نیچے گرا۔ اسی لمحے بابر کی لات اس کی ناف پر لگی۔ اس کے حلق سے بے ساختہ کراہ نکل گئی "اب سے مرنے تک تمہیں ایسی ہی اذیتیں سہنی پڑیں گی۔ آخر میں تم خواہش کروگے کہ تمہیں موت آجائے۔ تم مجھے نہیں روک سکتے۔ تم پہلے ہی میرے سامنے سر اُٹھانے کی مہلک غلطی کرچکے ہو۔ اس کی سزا تم بھگتتے رہوگے" اس نے کمال کے پیٹ میں ایک اور ٹھوکر ماری "تم پچھتاتے رہوگے کہ نذیر نے تمہیں مرنے سے کیوں بچایا" اس بار ٹھوکر کمال کے منہ پر لگی۔ اس کا ایک دانت ٹوٹ گیا پھر اسے ہوش نہ رہا۔

○☆○

اس کا جسم مڑا تڑا پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ انہیں کھول نہیں سکتا تھا۔ وہ محسوس کررہا تھا کہ اس کا جسم جیسے مائع کا روپ اختیار کرگیا ہے اور اسے کسی جگ... کسی پیالے میں بھردیا گیا ہے۔ دنیا جیسے ایک شٹر گرائے جانے سے کسی دُکان کی طرح اس پر بند ہوگئی تھی۔ ذہن کا جیسے جسم سے.... اور یوں درد سے رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے اپنے جسم کو محسوس کرنے' تصور میں اسے کوئی شکل' کوئی ساخت دینے اور حرکت دینے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش اس کی حالت کے پیشِ نظر بہت بڑی تھی۔ خیال کے زور پر ایک بہت بڑا پہاڑ تخلیق کرنا اور پھر خیال کی قوت سے ہی اسے مٹادینا اس کوشش کی نسبت بہت آسان تھا۔
اس کے اندر ہتھیار ڈالنے.... مزاحمت ترک کرنے کی ترغیب بہت طاقت پکڑ گئی تھی۔ اب جو ہو سو ہو۔ زیادہ سے زیادہ موت آجائے گی اسے۔ تو ویسے بھی بابر اسے قتل کرنے کا عہد کرچکا تھا۔ تو جب موت یقینی ہے تو پھر کسی چیز کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ شادی.... آبائی زمین پر گھر بسانا اور نسل بڑھانا.... اور بچّوں کو پڑھانا۔ یہ سب کسی اور.... بہت دور کی دنیا کی باتیں تھیں۔ اس وقت تو وہ جس صورتِ حال میں زندہ تھا' وہ جنگل کے قانون والی تھی۔ زیادہ طاقتور..... زیادہ فٹ آدمی جی سکتا تھا اور فٹنس کے اعتبار سے اس کی پوزیشن بہت ہی زیادہ کمزور تھی پھر بابر ایک بھیڑیا تھا۔ جبکہ وہ ایک شریف اور نفیس آدمی تھا۔ وہ اخلاقی ضابطوں کے تحت زندگی گزارنے کا عادی تھا۔ وہ بھیڑیے کے مقابلے میں بھیڑیا نہیں بن سکتا تھا۔ یعنی اس کا اور بابر کا کوئی جوڑ ہی نہیں تھا۔ اس لیے تو اس کا یہ حشر ہوا تھا۔ دوسری طرف تسکین کا سامان بھی تھا۔ بدترین صورتِ حال میں بھی وہ تہی دامن تو نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے بیشتر شاگردوں کو بچانے میں کامیاب رہا تھا اور اس نے بدی کے سامنے سر بھی نہیں جھکایا تھا۔ جو کچھ بھی ایسی صورتِ حال میں کیا جاسکتا ہے' اس نے کیا تھا۔
اچانک اسے اپنے والد کا خیال آگیا۔ وہ کہتے تھے.... زندگی جدوجہد کا نام ہے... ہتھیار ڈالنے کا نہیں۔ جدوجہد سے محروم زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے۔
اس نے سوچا' جب تک اس کا دماغ اور جسم کمزور دھاگے سے بندھے ہوئے ہیں' وہ خود کو تھکن اور اذیت کا عادی بنانے کی کوشش کرے گا۔ ان دونوں کمزوریوں کو زندگی کے اس ڈرامے میں چھوٹے اور ثانوی کردار دے گا اور جدوجہد جاری رکھے گا۔ وہ زخمی اور درماندہ جسم کے ہر احتجاج کو نظرانداز کردے گا۔ اسے چیلنج کا بہادری سے سامنا کرنا ہے۔
یہ سوچتے سوچتے وہ سوگیا۔
بابر ٹہلتے ٹہلتے رُکا اور اس نے سوئے ہوئے کمال رشید کو دیکھا۔ وہ ابھی تک دو متضاد خواہشوں کے درمیان لٹکا ہوا تھا۔ ایک خواہش کہتی تھی.... اس مسلمان کو ابھی ختم کردے۔ موت سے خوف زدہ نہ ہونا اس کی طاقت ہے... اور یہ طاقت کبھی ختم نہیں ہوگی۔ دوسری خواہش کہتی تھی.... نہیں' ابھی نہیں۔ ابھی اسے اذیتیں پہنچا۔ اس کا دل پہلی خواہش کا اسیر تھا لیکن جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا' اس شخص کو قتل کرنا دشوار سے دشوار تر ہوتا جارہا تھا۔ وہ ان کی ضرورت بنتا جارہا تھا۔ اب یرغمالیوں کی تعداد اتنی کم ہوچکی تھی کہ ان میں سے کسی کو ضائع نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ ایک ضروری تالے کی چابی کی سی حیثیت اختیار کرتا جارہا تھا۔ دوسرے یرغمالی اس پر انحصار کرتے تھے۔ وہ نہ رہا تو شاید باقی لوگ دہشت ہی سے مرجائیں گے۔ وہ ان کے لیے اُمید کی علامت تھا اور یرغمالیوں کی زندگی بہت اہم تھی۔ اس لیے کہ وہ ان کی اپنی زندگی کی ضمانت تھے۔

یہ سوچ کر اس کا خون کھولنے لگا۔ جب وہ پہلی بار کلاس روم میں داخل ہوا تو یہ شخص کمال رشید کچھ بھی نہیں تھا مگر اب وہ بڑھتا... پھیلتا جارہا تھا۔ ہر توہین اور ہر تشدّد کے بعد وہ پہلے سے زیادہ مضبوط اور طاقتور محسوس ہونے لگتا تھا۔ بابر کو اپنے اوور ہونے کا احساس ہونے لگا۔ شاید اس نے اپنے ہتھیار... غصہ'

دھمکیاں، تشدد اور موت کی دہشت... ضرورت سے زیادہ استعمال کر لیے تھے۔ اس لیے اب اسے ان کے استعمال پر اپنا من پسند ردِعمل نہیں مل رہا تھا۔ اس نے موت کو اس سخت جان دشمن سے محض ایک سانس کے فاصلے پر لا کھڑا کیا تھا مگر وہ اپنی جگہ ڈٹا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے شائبے کی پرچھائیں تک نہیں لرزی تھی۔ نذیر نے مداخلت کر کے اسے بچا لیا تھا... اور سچ یہ ہے کہ اچھا ہی کیا تھا۔ کیونکہ اس شخص کی اپنی ایک اہمیت تھی۔ تاہم بابر کو یہ اطمینان تھا کہ دیر سے سہی، اس کی خواہش پوری ضرور ہوگی۔ آخر میں وہ اس کے ہاتھوں بہرحال مارا جائے گا۔

فیکلٹی روم کے دروازے پر کھڑے ہوئے نذیر کو سوتے ہوئے اس شخص پر رشک آرہا تھا۔ وہ بابر کے بے داغ منصوبے کی واحد کمزوری بن گیا تھا اور وہ کیسا خوش نصیب تھا کہ بے فکری اور اطمینان سے سو رہا تھا جبکہ وہ چاروں، دن ہو یا رات، باری باری صرف چار گھنٹے سو سکتے تھے۔ خود اسے ابھی تک ایک گھنٹے سے زیادہ آرام کی مہلت نہیں مل سکی تھی۔ سو اب اس کے ہاتھ پاؤں ست پڑنے لگے تھے اور دماغ پر دُھند سی چھا رہی تھی۔ اس وقت دوپہر کا ایک بجنے والا تھا اور وہ جانتا تھا کہ ڈیڈلائن تک تو اسے آرام کی مہلت مل نہیں سکتی۔ بلکہ حفاظت سے نکل جانے تک وہ نہیں سو سکتا۔ اس نے حساب لگایا۔ ابھی کم از کم چودہ گھنٹے اسے نیند نہیں مل سکتی۔ اس خیال نے اس کی تھکن میں اور اضافہ کر دیا۔

وہ کمرے میں داخل ہوا اور کرسی پر جا بیٹھا۔ تینوں لڑکے صوفے پر گہری نیند سو رہے تھے۔ صوفیہ ایک کرسی پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ وہ بار بار جھٹکے سے بیدار ہوتی اور پھر دوبارہ اونگھنے لگتی۔ اس نے سوچا کہ وہ اس کی جگہ ہوتا تو وہ بھی اسی طرح سوتا۔ اس صورتِ حال میں کون سو سکتا ہے۔ سوائے لڑکوں کے... انہیں صورتِ حال کی سنگینی کا پوری طرح ادراک تو نہیں تھا اور پھر اس عمر کی نیند ایسی ہی ہوتی ہے کہ آدمی کانٹوں پر بھی بے خبر سو جائے۔ اس نے سوچا، کاش میں بھی ایسا ہی ہوتا۔ سب کچھ بھول بھال کر میٹھی نیند سو جاتا۔

اس نے سر گھما کر کمال رشید کو دیکھا۔ وہ زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہا تھا۔ اب وہ، وہ آدمی نہیں تھا، جسے اس نے ابتدا میں دیکھا تھا۔ بلکہ اس میں اس شخص کی جھلک بھی نہیں تھی۔ اس کا کوٹ اور قمیص کندھے پر سے پھٹی ہوئی تھی اور جا بجا خون کے دھبے تھے۔ ناک متورم تھی اور ایک طرف جھک گئی تھی۔ نتھنوں کے گرد خون کی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ بائیں رخسار پر نیل بھی پڑا ہوا تھا اور کٹ بھی تھا۔ پہلی نظر میں اس نے سوچا تھا کہ کاش وہ بھی اس شخص جیسا ہوتا۔ خوبرو، خوش لباس اور باوقار لیکن اب تو اسے دیکھ کر خوف آتا تھا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ کوٹ کے نیچے اب سوئٹر نہیں پہنے ہے۔ اس نے صوفیہ کی طرف دیکھا۔ ماسٹر کا سوئٹر اب وہ پہنے ہوئے تھی۔ سوئٹر کے بائیں کندھے پر گولی کا سوراخ بھی تھا اور خون بھی لگا تھا۔ نذیر کو حیرت ہوئی۔ اس حال میں ماسٹر نے یہ سوئٹر کیسے اُتارا ہوگا ماسٹرنی کے لیے! واقعی... آدمی حوصلے والا ہے۔ اچانک نذیر کو اس کے حال پر افسوس ہونے لگا۔ ابھی چند گھنٹے پہلے اس نے اس شخص کی جان بچائی تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ اسے پسند کرتا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ اس کے خیال میں یہ ضروری تھا۔ وہ ان کے لیے اہمیت رکھتا تھا۔ انہیں اس کی ضرورت تھی۔ اس نے بے حد سمجھ داری سے کام لیا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ شخص زیادہ دیر بچ نہیں سکے گا۔

بابر بلڈنگ کا جائزہ لے کر واپس آگیا۔ اس نے اپنے لیے ایک پیالی میں کافی انڈیلی اور نذیر کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔ اس سے قطع نظر وہ تروتازہ لگ رہا تھا۔ نذیر نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر اسے غیر معمولی تاثر نظر آیا "کیا بات ہے، کچھ پریشان لگ رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

بابر نے کافی کا گھونٹ لیا۔ اس کے چہرے پر سکون پھیل گیا "سب کچھ کنٹرول میں ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

"یہ بھی اچھا ہے کہ طلبا کم رہ گئے ہیں۔ ہم یہاں ان پر زیادہ بہتر طور پر نظر رکھ سکتے ہیں" نذیر بولا۔

"ہمیں وہاں ان پر بہتر طور پر نظر رکھنا چاہیے تھی۔ بڑی تعداد ہماری طاقت تھی۔"

"وہ صورتِ حال ایسی تھی کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔"

"نہیں۔ ہم نے انہیں بہت دیر تنہائی فراہم کر کے غلطی کی" بابر نے تلخ لہجے میں کہا "یوں کمال کو انہیں تیار کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ نہ ہوتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔"

"لیکن جو کچھ ہوا، وہ ہمارے لیے بہتر ہوا ہے" نذیر نے کہا "جانتے ہو، یہ جو لڑکا ہے رئیس، یہ وفاقی وزیرِ داخلہ کا بیٹا ہے۔"

بابر سنبھل کر بیٹھ گیا "اوہ... تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"خود ہی ڈینگ مار بیٹھا تھا۔ ماسٹر نے اسے چپ کرانے کی کوشش کی تھی۔"

"بس تو پھر پریشان ہونے کی کوئی بات ہی نہیں۔ سمجھ لو، ہم یہ کھیل جیت گئے۔"

اسی وقت انٹرکام کا بزر چیخا۔ پولیس کی کارروائی کے بعد سے یہ پانچویں کال تھی۔ بابر چند لمحے انٹرکام کو گھورتا رہا پھر اس نے ریسیور اُٹھالیا۔ "یس ذلیل مُلّے!" اس نے کہا۔

"بہت تپے ہوئے لگ رہے ہو؟" دوسری طرف سے جلیس نے کہا "کیا صورتِ حال اچھی نہیں معلوم ہو رہی ہے؟"

"نروس تو تم معلوم ہو رہے ہو۔ میں تو ۲۴ جانوں کا بوجھ کم ہونے پر خوش ہوں۔ میرے لیے سُنار کی سو کے مقابلے میں لوہار کی ایک زیادہ تسلی بخش ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے قبضے میں ایک وزیر زادہ بھی ہے۔ وہ تو ہزار یرغمالیوں سے بڑھ کر ہے۔"

جلیس پریشان ہوگیا۔ تاہم اس نے بے پروائی سے کہا "موت تو وزیروں کو بھی آتی ہے اور بادشاہوں کو بھی۔ اس معاملے میں امیر غریب برابر ہیں۔"

"درست لیکن ایک عام لڑکے کے مقابلے میں وزیر کے بیٹے کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ میں جانتا ہوں' اب ہمارے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی بلکہ ممکن ہے' رات کی کارروائی پر اب تک تم پر جھاڑ بھی پڑ چکی ہو۔ ایک بات بتاؤ' کیا تمہیں کارروائی سے پہلے یہ بات معلوم نہیں تھی؟"

بوتھ میں جلیس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ وار بہت کاری تھا۔ اس نے لہجے کو مضبوط بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "وقت آنے پر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے لیے ہر انسانی جان برابر کی اہمیت رکھتی ہے۔"

بابر استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ اس نے کرسی سے ٹیک لگا کر پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا "دیکھیں گے۔ جانتے ہو' تمہاری رات کی حماقت کے بعد سے میں اپنا منصوبہ بدلنے کے بارے میں غور کر رہا ہوں۔ سوچتا ہوں' تمام یرغمالیوں کو ٹھکانے لگا دوں اور اسکول کو اُڑا دوں۔"

"تمہیں اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔"

"یہ تو ہے۔ لیکن.... خیر چھوڑو۔ اب تم نے میری ہدایات پر عمل نہ کیا تو میں یہی کچھ کروں گا" بابر نے کہا۔ پھر اس نے کمال رشید کے فلسفے سے استفادہ کیا "تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمیں موت کی کوئی پروا نہیں۔ ہوتی تو ہم یہ کام نہ کرتے۔"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی پھر جلیس نے پوچھا "تم کیا چاہتے ہو؟"

"ایک تو یہ کہ تم رات جیسی کوئی اور حماقت سوچنا بھی نہیں۔ میرے پاس تین طلبا اور دو ٹیچر ہیں اور ایک لڑکے کی اہمیت سے تم خوب واقف ہو۔ سمجھ رہے ہو نا..." اسی وقت ریڈیو پر کھرکھراہٹ اُبھری اور پھر شہناز نے پوچھا "بابر... کیا ہو رہا ہے؟" بابر نے انٹر کام کے ریسیور کو ہاتھ سے ڈھانپا اور نذیر کو ریڈیو کی طرف اشارہ کیا "اس سے کہو' ابھی چپ رہے۔ میں ذرا انٹر کام پر بات کرلوں پھر اس سے بات کروں گا" پھر وہ نذیر کے شہناز کو سمجھانے کا انتظار کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے ریسیور سے ہاتھ ہٹایا "اب غور سے سنو ٹلے۔ میں چاہتا ہوں کہ پارکنگ ایریا میں ایک ویگن پہنچا دی جائے۔ چابیاں اگنیشن میں موجود ہوں اور ٹنکی فل ہونی چاہیے۔ میں سولہ سیٹ والی ویگن کی بات کر رہا ہوں۔ جس میں دونوں طرف چار چار شیشے ہوں اور اس ویگن میں سوٹ کیس میں بھرے پانچ کروڑ روپے بھی موجود ہوں۔ اس ویگن میں ہم چکلالہ ائرپورٹ تک جائیں گے۔ وہاں تمہیں ہمارے لیے ایک بوئنگ ۷۳۷ کا بندوبست کر کے رکھنا ہوگا۔ یہ سب لکھ رہے ہو نا؟ جہاز کے اندر تین افراد پر مشتمل عملے کے سوا کوئی نہ ہو۔ کوئی چالاکی نہ کرنا اس لیے کہ ہم جہاز کو پوری طرح چیک کریں گے۔ ہمارے ساتھ دھماکا خیز مادہ بھی ہوگا۔ کوئی بھی گڑبڑ ہوئی تو میں عملے سمیت جہاز کو اُڑا دوں گا۔ سمجھ گئے؟"

"ہاں۔"

"بس تو لکھتے رہو۔ میری بات ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ جہاز میں چھ پیراشوٹ بھی موجود ہونے چاہئیں۔"

"یہ تو یک طرفہ معاملہ لگتا ہے۔ یہ بتاؤ' یہ سب کچھ کر کے ہمیں کیا حاصل ہوگا؟"

"تمہیں صحیح سلامت جہاز' عملہ اور یرغمالی ملیں گے۔"

"دیکھو۔ تمہیں یہ سب کچھ مل جائے گا لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم یرغمالیوں کو یہیں چھوڑ کر جاؤ۔ میرا وعدہ ہے کہ ہم تمہیں روکنے کی کوئی کوشش نہیں کریں گے۔"

"مسخرا پن مت کرو۔ تم مطالبات کی پوزیشن میں نہیں ہو ایس پی۔ ٹھیک چھ بجے تک یہ تمام کام ہو جانے چاہئیں۔ اب بہتر یہ ہے کہ تم مصروف ہو جاؤ" بابر نے یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا پھر وہ نذیر کی طرف مڑا "کم بخت' چالاکی سے باز نہیں آتا لیکن اسے یہ نہیں معلوم کہ اس کا واسطہ کس سے پڑا ہے۔"

O☆O

ایس پی جلیس نے ریسیور رکھا اور سامنے رکھے پیڈ کو گھورنے لگا' جس پر اس نے شرائط لکھی تھیں لیکن وہ ایک اور بات سوچ رہا تھا۔ بیک گراؤنڈ میں جو اس نے نسوانی آواز سُنی تھی.... جو بابر کو پکار رہی تھی' اس میں کوئی عجیب سی بات تھی لیکن کیا؟ نسوانی آواز سُننا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ دہشت گردوں میں ایک عورت بھی شامل ہے۔ کاش... اس نے آواز ٹیپ کرنے کا کوئی بندوبست کر رکھا ہوتا۔ تب وہ یہ گفتگو دوبارہ سُن سکتا تھا۔

لڑکی نے کیا کہا تھا.... بابر' کیا ہو رہا ہے؟ ہاں یہی کہا تھا اس نے۔ اور آواز اسی کمرے سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ تو پھر یہ پوچھنے کا کیا مطلب کہ کیا ہو رہا ہے؟ ممکن ہے' لڑکی سو گئی ہو اور کال کے درمیان اس کی آنکھ کھلی ہو لیکن نہیں.... اس صورت میں تو وہ خود دیکھ سکتی تھی کہ کیا ہو رہا ہے لیکن اور کوئی بات بھی تھی... جانی پہچانی سی مگر وہ اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ چند لمحوں کی کوشش کے بعد اس نے اس خیال کو ذہن کے کسی دور کے گوشے میں دھکیل دیا۔ اس کے سامنے اور بھی مسئلے تھے۔ وزیر داخلہ مری آ چکے تھے لیکن انہوں نے بہت رازداری سے کام لیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اخبار نویسوں کو فی الوقت اس صورت حال کا علم ہو۔ انہوں نے اس سے بہت اچھی طرح بات کی تھی' اس کی حوصلہ افزائی کی تھی اور اس پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ انہوں نے اس سے

صورت حال پوچھی تھی۔ کارروائی کی تفصیل سُنی تھی اور مزید کارروائی کے امکان پر اس سے تبادلۂ خیال کیا تھا۔ وہ اس سے متفق تھے کہ اب مزید کارروائی یرغمالیوں کے لیے خطرناک ہوگی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ تاوان کی رقم شام تک پہنچ جائے گی اور انہوں نے خصوصی انسدادِ دہشت گردی اسکواڈ کا دستہ طلب کرلیا ہے لیکن جب تک مجرم اسکول میں ہیں، کیس کا انچارج وہی ہوگا۔ اس کے بعد اسکواڈ کا سربراہ کیس کا انچارج ہوگا۔ دونوں گروپ ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔ انہوں نے اسے فون نمبر بھی دیا، جس پر وہ ان سے رابطہ کرسکتا تھا۔

جلیس نے پہلا کام یہ کیا کہ وزیرِ داخلہ کو فون کرکے انہیں مجرموں کی شرائط سے آگاہ کیا "تو وہ یرغمالیوں کو یہاں رہا کرنے پر آمادہ نہیں؟" وزیر صاحب کے لہجے میں پریشانی تھی۔

"جی جناب۔"

"پیراشوٹ طلب کرنے کا مطلب ہے کہ وہ درمیان میں کہیں جہاز سے کود دیں گے۔"

"یہ بھی ممکن ہے کہ یہ فرمائش ہمیں دھوکا دینے کے لیے ہو" جلیس نے کہا۔

"ممکن ہے لیکن چھ پیراشوٹ کیوں۔ تمہارا کہنا ہے کہ دہشت گرد صرف چار ہیں۔ کہیں وہ بدعہدی تو نہیں کرنا چاہتے" وزیر کی آواز کسی اندیشے کے بوجھ سے لرزنے لگی۔

"کچھ نہیں کہا جاسکتا جناب۔"

"خیر.... دیکھو، میری یہ بات گرہ میں باندھ لو۔ تمہیں ان کی ہر ہدایت کی تعمیل کرنی ہے۔ اب ضرورت پڑنے پر تم ہوم منسٹری سے رابطہ کروگے، سمجھ گئے؟"

"جی ہاں جناب۔"

"گڈ لک۔"

رابطہ منقطع ہوگیا۔ اس کے بعد اسپتال سے فون آیا۔ دو زخمی جوانوں میں سے ایک چل بسا تھا دوسرے کی حالت بدستور تشویش ناک تھی۔ جلیس کا وجود غصے سے پھنکنے لگا۔ کاش.... اسے موقع ملے۔ بابر اب اس کا ذاتی شکار بن گیا تھا۔ اس کے تین جوان زندگی سے محروم ہوچکے تھے۔

اگلے ایک گھنٹے وہ مواصلاتی ٹرک میں رابطوں میں مصروف رہا۔ یہ ٹرک دو گھنٹے پہلے آیا تھا اور میدان میں کھڑا تھا۔ اب اس کے لیے رابطہ کرنا زیادہ آسان ہوگیا تھا۔ اس نے ویگن کا بندوبست کیا اور راولپنڈی پولیس کو الرٹ رہنے کی ہدایت کی۔ فی الحال تو کیس اس کے ہی ہاتھ میں تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ آہستہ آہستہ معاملہ اس کے ہاتھ سے نکلتا جارہا ہے۔ انسدادِ دہشت گردی اسکواڈ کا انچارج میجر نصیر تھا۔ وہ اس سے خندہ پیشانی سے ملا لیکن انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ خوش نہیں ہے۔ مسئلہ وہی پیشہ ورانہ رقابت کا تھا۔

جلیس ٹرک سے نکلا تو خاصا بہتر محسوس کررہا تھا۔ اب اس کی ذمّے داری میں اور لوگ بھی شریک ہوگئے تھے تو وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کررہا تھا لیکن ساتھ ہی اس معاملے کو خود ہی کامیابی سے نمٹانے کی خواہش بھی زور پکڑ گئی تھی۔ اس کے پاس نفری کی کمی نہیں تھی۔ تو کیا وہ چار افراد کو.... صرف چار افراد کو ایک بھیانک جرم کامیابی سے کرنے سے نہیں روک سکتا تھا؟

وہ اپنے بوتھ کی طرف چل دیا۔ اس عزم کے ساتھ کہ مجرموں کو روکنے کی ایک کوشش اور کرنی ہے۔

وہ لسٹ ہاتھ میں لیے کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ میز پر رکھا واکی ٹاکی بڑبڑایا "سر.... پرنسپل جمیل الرحمان صاحب آپ سے ملنے آنا چاہتے ہیں۔"

اس نے ایک بٹن دبایا اور کہا "بھیج دو انہیں۔"

جمیل الرحمان جس وقت بوتھ میں داخل ہوا، جلیس بیٹھا واکی ٹاکی کو گھور رہا تھا۔ اس نے جمیل الرحمان کو آتے اور دو پیالیوں میں کافی انڈیلتے بھی نہیں دیکھا۔ جمیل الرحمان نے کافی کی پیالی اس کی طرف بڑھائی تو وہ چونکا۔

"کیا بات ہے۔ کسی گہری سوچ میں گُم ہو؟" جمیل الرحمان نے پوچھا۔

"ایک بات مجھے مسلسل پریشان کررہی ہے۔ میں اسے ذہن سے جھٹک نہیں پارہا ہوں۔"

"کوئی اہم بات ہے؟"

"میں انٹرکام پر مجرموں کے سرغنے سے بات کررہا تھا کہ پس منظر میں مجھے ایک عجیب سی آواز سُنائی دی۔ میں اس کی نوعیت نہیں سمجھ پارہا ہوں" جلیس نے پُرخیال انداز میں کہا پھر چونک کر پوچھا "ایک بات بتائیں۔ فیکلٹی روم میں فون کی سہولت موجود ہے؟"

"نہیں۔ صرف انٹرکام ہے وہاں۔"

"مجھے یقین ہے کہ میں نے پس منظر میں گھُٹی گھُٹی سی.... کھرکھراتی ہوئی نسوانی آواز سنی تھی۔ اب مجھے خیال آرہا ہے کہ اس کے فوراً بعد بابر نے ریسیور پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس کے باوجود جو کچھ اس نے کہا، میں نے سُن لیا تھا۔ اس نے لڑکی کو خود خاموش رہنے کو نہیں کہا تھا۔ اس نے نذیر سے کہا تھا کہ اسے چپ کراؤ۔ میں بعد میں بات کروں گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بولنے والی کمرے میں موجود نہیں تھی۔ بات سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ آواز سے لگتا تھا کہ بولنے والی اسی کمرے میں موجود ہے۔"

"ممکن ہے، وہ ایک دوسرے سے واکی ٹاکی کے ذریعے رابطہ کررہے ہوں" جمیل الرحمان نے رائے زنی کی۔

"میں نے بھی یہی سوچا تھا لیکن بچ نکلنے والے طلبا میں سے کسی نے بھی دہشت گردوں کے پاس ریڈیو نہیں دیکھا۔ جبکہ وہ چاروں اکٹھے بھی کلاس روم میں موجود رہے۔"

پرنسپل نے پیکٹ میں سے دو سگریٹیں نکالیں اور ایک جلیس کی طرف بڑھائی "یہ بھی تو ممکن ہے کہ ان کا کوئی ساتھی باہر موجود ہو... کسی ایسی جگہ، جہاں سے اسکول پر نظر رکھی جاسکتی ہو۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا" جلیس نے کہا "میں یہ بات نہیں سمجھ سکا کہ آخر انہوں نے ہمہ وقت ایک آدمی کلاس روم میں کیوں نہیں رکھا، جو یرغمالیوں پر نظر رکھتا۔ اس صورت میں کوئی ایک یرغمالی بھی نہ نکل پاتا۔ اس صورت میں انہیں ہماری کارروائی کا ابتدا ہی میں علم ہوجاتا" وہ اُٹھ کھڑا ہوا "آپ پلیز یہیں موجود رہیں۔ میں اب اپنے اس آدمی سے بات کروں گا، جس نے علاقہ خالی کرایا تھا۔ میں اس سے کہوں گا کہ ہر اس دروازے کو دوبارہ چیک کرے، جہاں سے جواب نہیں ملا تھا اور اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہاں کوئی موجود نہیں" وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اس وقت اس کے ذہن میں ایک ہی خیال تھا... کاش، اس کے بعد کچھ زیادہ مہلت ہوتی... زیادہ وقت ہوتا!

○☆○

نذیر کے لیے وقت گھسٹ گھسٹ کر گزر رہا تھا۔ اس نے سونے کی کوشش کی لیکن وہ نیند اور بیداری کے درمیان معلق ہونے کی بدترین کیفیت سے دوچار رہا۔ اس کا جسم نیند کے لیے فریادیں کررہا تھا لیکن اس کے ذہن کو ہر آواز، ہر آہٹ سے جھٹکا لگ رہا تھا۔ مشکور اور شہلا کھانا کھانے کے لیے آئے تو انہوں نے حتی الامکان آہستگی سے کام لیا۔ تاکہ اس کی نیند میں خلل نہ پڑے مگر صوفیہ بے آرام نیند میں ہذیانی انداز میں بڑبڑائے جارہی تھی۔

پانچ بجے کے قریب نذیر تنگ آکر اُٹھ بیٹھا۔ بابر نے روانگی کی تیاریاں شروع کردی تھیں۔ وہ ہچکچاتے ہوئے اس کی مدد کرنے کے لیے اُٹھا۔

فیکلٹی روم میں زندگی اور اُمید کی لہر دوڑ گئی تھی۔ شاید اسیر اور صیاد دونوں ہی خوش تھے کہ جمود ٹوٹ گیا ہے اور اب وہ کچھ مختلف کام کررہے ہیں۔ اسکول کی عمارت اب انہیں کاٹنے کو دوڑ رہی تھی۔ گزشتہ رات کے حملے اور اس کے بعد کی کشیدگی نے سب کو نڈھال کردیا تھا۔ بابر کے سوا کوئی ایسا نہیں تھا، جو دوبارہ اس صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو اور اس کی ہمت رکھتا ہو۔ وہ سب چاہتے تھے کہ اب جلد از جلد یہ معاملہ ختم ہو اور انہیں سکون اور تحفظ کا احساس میسر آئے۔

نذیر اس اُمید پر بے یقینی کا کوئی سایہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ بابر سے یرغمالیوں کے مستقبل کے متعلق بات کرتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ ایک وقت ایسا تھا، جب وہ یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ محفوظ رہیں گے۔ بابر منصوبے کی کامیابی کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ لہٰذا خون خرابے کا کوئی امکان نہیں تھا، اس پر مستقبل کے منصوبوں کی کامیابی کا انحصار تھا۔ انہیں یہ تاثر چھوڑنا تھا کہ زرِ تاوان کی ادائیگی یرغمالیوں کے تحفظ کی ضمانت ہوتی ہے۔ ورنہ آئندہ کون سوچے گا کہ یرغمالیوں کی لاشوں کے لیے بھاری زرِ تاوان ادا کیا جائے۔ یوں تو مستقبل میں صرف کمانڈو کارروائیاں ہوتا تھیں مگر اب وہ جانتا تھا کہ بابر کا رویہ بدل گیا ہے۔ اس نے منطق کو شاید اپنے نئے نکتہ نظر کے حق میں اُلٹ دیا تھا۔ اب وہ یرغمالیوں کو ختم کرنے کے لیے یہ دلیل دے گا... اس طرح پولیس کو معلوم ہوجائے گا کہ ان کی حماقت کے جواب میں ہم کیا کرسکتے ہیں، وہ یرغمالیوں کی موت کی ذمّے داری پولیس پر ڈال دے گا۔ وہ کہے گا... اگر پولیس نے کارروائی نہ کی ہوتی تو یرغمالیوں کا بال بھی بیکا نہ ہوتا، اس نے مجبوراً پولیس کو اپنی ہٹ دھرمی اور بے عقلی کی سزا دی ہے۔ بابر میں یہ عجیب وصف تھا کہ وہ اپنے ہر نکتہ نظر کو درست ثابت کردیتا تھا اور نذیر جانتا تھا کہ یرغمالیوں کو ختم کرنے کی بابر کی خواہش بے حد توانا ہے۔

اسے شہناز کی آواز نے چونکا دیا۔ اس نے ریڈیو اُٹھایا "کیا بات ہے؟"

شہناز نے کہا "وجہ مجھے نہیں معلوم لیکن اپارٹمنٹ بلڈنگ کو دوبارہ چیک کیا جارہا ہے" اس کے لہجے میں پریشانی تھی "باہر خاصی تعداد میں پولیس والے نظر آرہے ہیں۔"

"تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ پولیس اسکول کے پارکنگ ایریا کو نہیں گھیر رہی ہے... اور ہمیں روکا نہیں جائے گا؟" نذیر کو اپنی فکر پڑی تھی۔

بابر کمرے میں چلا آیا اور ان کی گفتگو سُننے لگا۔

"ممکن ہے، گھیر رہے ہوں، مگر میں کیا کروں، میں نروس ہورہی ہوں۔"

"وہ دوبارہ دستک دیں، تب بھی دروازہ نہ کھولنا۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا" نذیر نے اسے تسلی دی "اب اسکول کی صورتِ حال بتاؤ۔"

"میدان میں ایک ٹویوٹا ہائی ایس ویگن کھڑی کردی گئی ہے۔"

"رقم کا سوٹ کیس بھی دکھائی دیا؟"

"ابھی تک تو نہیں دیکھا۔ اتنی گاڑیاں آجارہی ہیں کہ سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"رقم آجائے تو ہم بیس منٹ کے اندر اندر نکل لیں گے۔" نذیر نے آہ بھر کے کہا۔

"نذیر... میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں جاسکتی کیا؟ پلیز... مجھے بھی لے چلو تم لوگ۔"

"نہیں" بابر نے مداخلت کی "اس سے کہو کہ یہ بعد میں مقررہ مقام پر پہنچے گی... اکیلی۔ منصوبے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔"

نذیر نے وہ پیغام ریڈیو پر دُہرا دیا۔

"مجھے پولیس والوں کی موجودگی سے ڈر لگ رہا ہے۔ نذیر... پلیز... مجھے ساتھ ہی لے چلو۔"

"فکر نہ کرو۔ جلد ہی ہم ملیں گے شہناز۔"

"اچھا۔۔ اپنی طرف کی کوئی خاص خبر تو سُناؤ۔"

نذیر نے کن انکھیوں سے بابر کو دیکھا' جو دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے سرگوشی میں کہا "رات بابر نے ایک طالبہ کے ساتھ زیادتی کی۔ نازیہ نام تھا اس کا۔۔۔ نازیہ توقیر۔"

ریڈیو پر چند لمحے خاموشی رہی "نازیہ توقیر" پھر شہناز نے عجیب سے لہجے میں دُہرایا۔

"کیوں؟ تم جانتی ہو اسے؟"

"نہیں۔۔ نہیں تو۔ بس توقیر نام کا ایک شخص یاد آگیا تھا۔۔۔ کاش۔۔ کاش۔۔" ساتھ ہی ریڈیو آف ہو گیا۔

بابر کمرے میں واپس آیا اور عجیب سی نظروں سے انٹر کام کو دیکھتا رہا۔ نذیر نے جان لیا کہ اس وقت اس ذہن میں کوئی خوش گوار سوچ نہیں ہو سکتی۔ اچانک بابر تیزی سے ایڑیوں کے بل گھوما اور تند لہجے میں بولا "اگر انہوں نے کوئی حماقت کی تو اس بار عمر بھر پچھتائیں گے اور تم۔۔۔ تم اس بار مجھے روکنے کی غلطی نہ کرنا۔"

○☆○

شہناز نے ریڈیو آف کیا اور کرسی سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ اس کے تصور میں فلم سی چلنے لگی۔ اپنی بربادی کی فلم! توقیر کا نام سُن کر اسے وڈیو والا توقیر یاد آگیا تھا۔ توقیر جس نے صرف اسے ہی نہیں' جانے اس جیسی کتنی معصوم لڑکیوں کو تباہ کیا ہوگا۔ اس کے گھرانے جیسے کتنے ہی گھرانوں کو برباد کیا ہوگا۔ کاش یہ نازیہ اسی توقیر کی بیٹی ہو۔ عمل مکافات اسی کو تو کہتے ہیں لیکن نہیں' یہ کیسے ممکن ہے۔۔۔ کہاں ممکن ہے۔ خدا بھی ایسوں کو ڈھیل دیتا ہے۔ ان کی رسی کہاں کھینچی جاتی ہے اور پھر کہاں کراچی اور کہاں مری کا یہ اسکول! ۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ کاش۔۔۔ کاش۔

اچانک وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جس زخم کے متعلق وہ سمجھ رہی تھی کہ مندمل ہو چکا ہے' اب بھی ہرا تھا۔ ایک یاد کی ٹھیس لگی تھی تو ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔

وہ روتی رہی۔۔۔ کیا میرے قاتل کا احتساب کرنے والا کوئی نہیں۔۔۔ کوئی بھی نہیں؟ نہ زمین پر' نہ آسمان پر! کیا میری تباہی کا حساب کوئی نہیں لے گا؟ خدا بھی نہیں!

○☆○

جلیس نے اپنی گھڑی پر اور پھر انٹر کام پر نظر ڈالی۔ سب کچھ سیٹ تھا۔ تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ نیچے ویگن تیار کھڑی تھی۔ چار سوٹ کیسوں میں پانچ کروڑ روپے کی رقم بھی پہنچ چکی تھی۔ رقم پولیس کی ایک گاڑی میں رکھی تھی۔ جلیس نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اردگرد کی عمارتوں سے کوئی دیکھ بھی رہا ہو تو اسے رقم کے سوٹ کیسوں کی جھلک بھی دکھائی نہ دے اور اب اس کے سامنے ایک مشکل فیصلہ تھا۔ ایک طرف تو وہ بابر کو مشتعل کرنے سے خوف زدہ تھا۔ دوسری طرف وہ اسے کامیاب بھی نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اسے مہلت درکار تھی۔ اسکول کے قریب کی عمارتوں کی تلاش کا ابھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ نتیجہ نکلے گا ضرور۔ اگر مجرموں کی باہر والی ساتھی پکڑی گئی تو اس سے کام کی معلومات حاصل کی جا سکیں گی۔ ویسے بھی اس قسم کی صورتِ حال میں دنیا بھر میں ایک ہی حکمتِ عملی آزمائی جاتی ہے۔ دہشت گردوں کو لٹکائے رکھنا اور انہیں تھکانا۔ جب وہ تھک جاتے ہیں تو ان کا ارتکاز اور ان کی قوتِ فیصلہ متاثر ہوتی ہے۔ ان کا دفاع کمزور ہو جاتا ہے۔ ایسے میں انہیں ہتھیار ڈالنے پر بھی مجبور کیا جا سکتا ہے اور دوسری صورت میں ان پر کاری وار کرنا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔

لیکن ایک مسئلہ تھا۔ اوپر کے احکامات تھے کہ مجرموں کا ہر مطالبہ تسلیم کر لیا جائے۔ اس میں جلیس کو توہین محسوس ہو رہی تھی۔ گویا اوپر والے اس کی اہلیت پر یقین نہیں رکھتے۔ سب سے بڑا مسئلہ یرغمالیوں میں وزیرِ داخلہ کے بیٹے کی موجودگی کا تھا۔ اب اگر جلیس اپنے طور پر مجرموں کو روکنے کے لیے کوئی قدم اٹھاتا تو نہ جانے اس کا کیا حشر ہوتا اور لٹکائے جانے کی صورت میں بابر کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اب تک جلیس اس کی فطرت کو بڑی حد تک سمجھ سکتا تھا۔

پھر اس نے سوچا' اس کا کیریئر تو ویسے ہی داؤ پر لگ چکا ہے۔ وزیرِ داخلہ نے اسے سراہا تھا لیکن سیاست دانوں کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ اس پر کئی الزام لگتے تھے آخر میں۔ اسے کارروائی کے سلسلے میں جواب دہی کرنی تھی۔ پھر اس کے بیٹے کی یرغمالیوں میں موجودگی بھی زیرِ غور آتی۔ ہر صورت میں پھندے کے لیے مناسب ترین گردن اسی کی ہوتی۔ لہٰذا اب ڈرنا کیا؟

وہ بابر کی بے رحمی سے خوف زدہ تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک آخری کوشش ضرور کرنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ محض چند گھٹیا مجرموں کے سامنے اس کا محکمہ ذلیل ہو۔

اسی وقت واکی ٹاکی گنگنایا۔ اس نے بٹن دبایا "سر۔ توقیر نامی ایک صاحب آئے ہیں۔ ان کی بیٹی نازیہ یرغمالیوں میں شامل ہے۔"

جلیس سمجھ گیا۔ اس لڑکی کا باپ' جس کے ساتھ بابر نے زیادتی کی تھی "ان سے کہو۔ میں ابھی نیچے آتا ہوں۔"

واکی ٹاکی بند کر کے وہ انٹر کام کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے ریسیور اُٹھایا اور ٹیلی گرام روم کا نمبر دبایا۔

بابر نے فوراً ہی جواب دیا' لگتا تھا وہ انٹر کام کے پاس ہی منتظر بیٹھا تھا۔

○☆○

بابر کے چہرے کے تاثر سے نذیر نے اندازہ لگایا کہ وہ کسی اچھی خبر کی توقع نہیں کر رہا ہے۔ اس نے ریسیور اُٹھا کر کہا "یس؟"

دوسری طرف سے ایس پی جلیس نے کہا "مجھے افسوس ہے کہ رقم آنے میں تاخیر ہو رہی ہے۔"

"پانچ منٹ کے اندر اندر ویگن رقم سمیت نیچے پہنچ جانی چاہیے۔"

"دیکھو... ہم ناممکن کو تو ممکن نہیں بنا سکتے۔ تم جانتے ہو کہ آج جمعہ ہے۔"

"میرے منصوبے کے عین مطابق" بابر نے سرد لہجے میں کہا "یہ جس لیول کا معاملہ ہے۔ اس میں بینکوں کی چھٹی کی کوئی اہمیت نہیں۔"

"اس کے باوجود..."

بابر نے اس کی بات کاٹ دی "صرف اور صرف پانچ منٹ ہیں تمہارے پاس۔"

"سُنو... کم از کم دو گھنٹے ضرور لگیں گے۔"

"تم بہت احمق آدمی ہو گئے... بہت ہی بے وقوف" بابر پھنکارا "میں تمہیں ہر طرح کی وارننگ دے چکا ہوں۔ اب تمہیں پتا چل جائے گا" اس نے ریسیور پٹخا اور اٹھ کر کمرے کے وسط میں گیا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ وہ کمال کو گھورتا رہا۔ اس کے اندر اس شخص کے لیے نفرت اُمڈ رہی تھی۔ وہ اس کی طرف ایک قدم بڑھا مگر رک گیا۔ ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں دھند سی اُتری لیکن فوراً ہی چھٹ گئی۔ اب اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ اس نے رخ بدلا اور نازیہ کی طرف بڑھنے لگا۔ رئیس اور مظفر سہم کر ایک طرف ہٹ گئے۔ نازیہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور ہذیانی انداز میں چلّانے لگی۔ بابر نے اس کا ہاتھ تھاما اور جھٹکے سے اسے صوفے سے کھینچا۔ وہ اسے فرش پر گھسیٹتے ہوئے دروازے کی طرف لے چلا۔ نازیہ نے مزاحمت کی کوشش کی۔ پہلے اس نے ایک کرسی پکڑی... پھر دروازے کا فریم لیکن بابر کو اس کا احساس بھی نہیں ہوا۔ وہ اسے راہداری میں گھسیٹ لے گیا۔

کمال بڑی جدوجہد کر کے کرسی سے اُٹھا اور اس نے پاس سے گزرتی ہوئی نازیہ کی ٹانگ پکڑنے کی کوشش کی لیکن رائفل کی نال نے اسے دوسری طرف اُلٹ دیا۔ پھر بھی وہ اٹھ کر دروازے کی طرف دو قدم بڑھا۔ اس بار رائفل کی نال اس کے پیٹ میں لگی۔ وہ نال کو دور ہٹاتے ہوئے پھر بھی بڑھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن نذیر رائفل آگے بڑھائے اپنی جگہ مضبوطی سے کھڑا رہا۔ وہ نفی میں سرہلائے جا رہا تھا "تم اسے روک نہیں سکتے ماسٹر۔ تم صرف مر سکتے ہو" اس کے لہجے میں دھمکی نہیں، التجا تھی اور نذیر سچ کہہ رہا تھا۔ جو کچھ ہونے والا تھا، اسے روکا نہیں جا سکتا تھا۔ بابر کو کوئی بھی نہیں روک سکتا تھا۔

لیکن کمال اسے دھکیلنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ بار بار سر جھٹک رہا تھا۔ اس کے اندر اس حقیقت کی قبولیت موجود تھی کہ کچھ نہیں کیا جا سکتا مگر وہ اس سے لڑ رہا تھا۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے رائفل کی نال پر جھپٹا مارا لیکن رائفل تیزی سے پیچھے ہٹالی گئی۔ وہ ایک قدم اور آگے بڑھا۔ اسی لمحے رائفل کا دستہ اس کے زخمی کندھے سے ٹکرایا۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی اور اس کی ٹانگیں جواب دے گئیں۔ درد اس کے پورے جسم میں دوڑ گیا۔ متلی کا احساس جاگ اٹھا پھر بھی اس نے رینگ کر دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی لیکن آدھے راستے میں ہی بے ہوشی کے اندھیرے نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

نازیہ کی چیخیں پوری بلڈنگ میں گونج رہی تھیں... درودیوار سے پھوٹتی محسوس ہو رہی تھیں... کلاس روم میں پہنچنے کے بعد بابر نے نازیہ کو چھوڑ دیا، جو مسلسل پنجے اور لاتیں چلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے نازیہ کے ٹھوکر ماری۔ یوں اس کی ٹانگ نازیہ کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ بابر نے جھک کر لڑکی کو بالوں سے پکڑا... اور اسے گھسیٹتے ہوئے اندر لے گیا۔ اس وقت اسے لڑکی سے شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس کے لیے اس پلیٹ کی طرح تھی، جس میں ایک بار کھانا کھا کر اسے پھینک دیا جاتا ہے۔ اس نے اس کے بالوں کو اپنی کلائی پر لپیٹا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے سر پر پوری قوت سے گھونسا مارا پھر اس نے شاٹ گن فرش پر پھینکی اور اپنے آزاد ہاتھ سے کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ باہر اس نے اسٹیڈیم کے اسکورنگ بوتھ کی طرف دیکھا۔ فاصلہ زیادہ تھا پھر بھی اسے ایک ہیولا سا شیشے کے بوتھ میں کھڑا نظر آ رہا تھا۔ وہ اسی کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

بابر نے بڑی تیزی سے لڑکی کو بالوں سے تھام کر کھڑا کیا اور اپنی بیلٹ سے ریوالور نکالا۔ ایک ہی وار میں کھڑکی کا بچا کھچا شیشہ بھی ٹوٹ گیا۔ اس وقت اس کے دل میں رحم کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ اس نے ریوالور نازیہ کی کنپٹی سے لگایا اور ٹریگر دبا دیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے لڑکی کو اُٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

○☆○

ایس پی جلیس نے وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ اسے سلوموشن میں ٹی وی پر چلنے والا کوئی غیر حقیقی منظر لگا تھا۔

کھڑکی سے پردے ہٹے۔ لڑکی کا معصوم چہرہ نظر آیا پھر لڑکی کو بالوں سے پکڑ کر اٹھانے والا ہاتھ نگاہوں سے اوجھل ہوا... صرف ایک ثانیے کے لیے پھر اس ہاتھ نے کھڑکی کا شیشہ توڑا۔ لڑکی کے ہاتھ بے نام مزاحمت کے لیے اوپر اُٹھے پھر براؤن بالوں کے ہالے میں وہ چاند سا حسین چہرہ... وہ خوب صورت سر، اور پھر جیسے کیمرہ ٹرک کے ذریعے وہ سر اور چہرہ چٹختا بکھرتا نظر آیا... سلوموشن میں۔ اسے فائر کی آواز نہیں سُنائی دی۔ اس کا دماغ جیسے سُن ہو گیا تھا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بے سری اس گڑیا کو دھیرے دھیرے نیچے گرتے دیکھا۔ اب وہ چھوٹی سی گٹھری زمین پر کھلی پڑی تھی۔ وہ آگے کی طرف جھکا۔ اس نے ہاتھ پھیلائے، جیسے بچی کو زمین سے اٹھا کر اپنی حفاظت میں لینا چاہتا ہو مگر اس کے ہاتھ شیشے کی دیوار سے ٹکرا کر رہ گئے۔ وہ مڑی تڑی، ٹوٹی پھوٹی گڑیا زمین پر بکھری پڑی

تھی۔ وہ زندگی سے محروم ہو گئی تھی..... صرف اس لیے کہ اس نے ایک احمقانہ فیصلہ کرنے کی غلطی کی تھی۔

اسے احساس بھی نہیں تھا کہ اس کی انگلیاں شیشے کی دیوار میں گھُسنے کی کوشش کر رہی ہیں اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ اس نے واکی ٹاکی کی بڑبڑاہٹ بھی نہیں سُنی۔ اس کی توجہ صرف زمین پر پڑے اس بے جان وجود پر مرکوز تھی۔ وہ اس کی بیٹی تھی..... وہ بیٹی، جس کی اس نے عمر بھر آرزو کی تھی لیکن قدرت نے اسے اس کے گھر میں نہیں اُتارا تھا۔ بلکہ اس کے لیے دنیا کی ہر بچی..... ہر لڑکی کو اس کی بیٹی بنا دیا تھا اور اب اس کی وہ بیٹی مر گئی تھی..... اس سے ہمیشہ کے لیے چھن گئی تھی۔ صرف اس لیے کہ اس نے اپنی انا کے زیرِ اثر غلط فیصلہ کر کے اسے بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ شاید اس لیے خدا نے اسے بیٹی نہیں دی تھی۔ وہ بیٹی کا باپ بننے کا اہل ہی نہیں تھا۔ بیٹی کے باپ کہیں ایسے ہوتے ہیں!

وہ پہلا موقع تھا کہ اسے اپنے سینے میں دل کے مقام پر کند دھار کے ایک نامانوس درد کا چاقو اترتا محسوس ہوا۔ اس درد نے ہی اسے اس جہنم سے رہائی دلائی، جس میں وہ جل رہا تھا۔ اس درد نے ہی اسے گرد و پیش کا احساس دلایا۔ بوتھ میں کوئی موجود تھا۔ وہ اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کے بازو کو تھام کر جھنجھوڑ رہا تھا اسے۔ وہ ایک ہی بات بار بار دُہرائے جا رہا تھا۔ بالآخر اس کی سماعت کا بند دروازہ کھل گیا۔

"کیا ہوا سر؟ آپ ٹھیک تو ہیں۔"

وہ جھٹکے سے شیشے کی دیوار سے پیچھے ہٹا۔ اس نے سر گھُما کر اپنے انسپکٹر کو دیکھا اور یوں بولا جیسے میلوں دور سے بول رہا ہو "ان خبیثوں کو ویگن دے دو۔ انہیں اس لعنتی رقم کے وہ سوٹ کیس بھی دے دو اور عمارت کے پاس سے ہر جوان کو ہٹا لو۔ انسدادِ دہشت گردی والوں کو بھی ہٹا دو۔ انہیں جانے دو۔ روکنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔"

انسپکٹر چند لمحے اسے اُلجھن بھری نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا "بہت بہتر سر۔"

ایس پی جلیس کی نظریں انٹرکام پر جم گئیں۔ اس کے درد سے نڈھال دل میں وحشت کی ایک تند لہر اٹھی۔ اس نے سینے پر رکھا دل کو تھامنے والا ہاتھ اٹھایا اور انٹرکام کو تار سمیت اکھاڑ پھینکا۔ اس پر بھی وحشت میں کمی نہیں ہوئی تو اس نے پلاسٹک کے اس بکس کو اٹھا کر بوتھ کے دروازے سے باہر پھینک دیا۔

○☆○

شہناز اپنے آنسوؤں سے لڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اپنی چیخ کو روکنے کے لیے اس نے اپنی سختی سے بھینچی ہوئی مٹھی منہ میں ٹھونس لی تھی۔ ہاتھ میں جہاں اس کے دانت گڑے تھے، خون نکل آیا تھا۔ اس نے اس بے رحمانہ فعل سے منہ موڑنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بہت سرعت سے انجام دیا گیا تھا اور اب اس کی نظریں زمین پر پڑے ٹوٹے پھوٹے وجود پر جمی تھیں۔ اس نے یہ نہیں دیکھا کہ لڑکی کو کس نے شوٹ کیا ہے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ صرف بابر ہی اس سفاکی کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔

اب وہ سوچ رہی تھی۔ میں نے یہ کیا کیا؟ ایسے سفاک آدمی سے کیوں منسلک ہوئی میں! لیکن فوراً ہی اسے اپنے اندر سے جواب بھی مل گیا..... اندھا جواب۔ اب اس گروپ کے سوا دنیا میں اس کا ہے ہی کون..؟ وہ پہلے ہی ذلت کی انتہائی پستیوں میں گر چکی تھی۔ "لیکن اب تو تم اس سے بھی نیچے چلی گئی ہو" ضمیر نے پکارا "کیا تم خود کو اس معصوم لڑکی کا قاتل تسلیم نہیں کرو گی؟ کیا بابر نے تمہاری کمزوریوں کو ایکسپلائٹ نہیں کیا؟ کیا تم اس کی نظروں میں سرخرو ہونے کے لیے پہلے ہی ایک معصوم آدمی کو قتل نہیں کر چکی ہو؟ اب تم مظلوم نہیں، ظالم ہو۔" اس کے پاس اس ہٹ دھرمی کے سوا کوئی دفاع نہیں تھا کہ اب یہی لوگ اس کی فیملی ہیں۔

اسے پتا بھی نہ چلا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ اس نے اسکول کی طرف دیکھا۔ اسکول کے افتادہ سرے والے داخلی دروازے پر ویگن کھڑی کر دی گئی تھی۔ پولیس والے باہر جا رہے تھے۔ سڑک پر سے رکاوٹیں ہٹائی جا رہی تھیں۔ اسٹیڈیم بھی خالی ہو گیا تھا اور پارکنگ ایریا بھی۔ البتہ اسٹیڈیم کے اسکورنگ بوتھ میں ایک شخص موجود تھا۔ وہ بھی اب باہر نکل رہا تھا۔

شہناز نے دوربین کا رخ لڑکی کی لاش کی طرف کیا۔ اسے دھچکا لگا۔ اسے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ جو شخص لڑکی کی لاش کو سینے سے لگائے زمین پر گھٹنے ٹیکے بیٹھا تھا، اس کا چہرہ اس طرف تھا..... اور وہ وہی توقیر تھا..... اس کا اپنا قاتل۔ ویڈیو شاپ والا توقیر۔

شہناز کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ تو دنیا میں بھی انصاف ملتا ہے! انسانوں سے نہیں ملتا تو خدا سے تو ملتا ہے لیکن ایسا کیوں ہے کہ اس کے کلیجے میں ٹھنڈ نہیں پڑی۔ وہ خوش کیوں نہیں ہے۔ وہ اب بھی دکھی ہے..... اس درندہ نما انسان کی بیٹی کے لیے، جو بہرحال معصوم اور بے گناہ تھی۔

پھر ایک پولیس والا آیا اور توقیر کو سہارا دے کر اپنے ساتھ اسکول سے باہر لے گیا۔ دوسری طرف اسٹیڈیم کے اسکورنگ بوتھ میں موجود شخص مضطربانہ انداز میں ٹہل رہا تھا۔

اسکول کی عمارت کا داخلی دروازہ تھوڑا سا کھلا اور شہلا اور نذیر نے محتاط انداز میں سر نکال کر جھانکا۔ وہ لوگ اس کی طرف سے مثبت اطلاع کے باوجود کوئی خطرہ مول نہیں لے رہے تھے پھر دروازہ پوری طرح کھلا اور نذیر نے بھاگتے ہوئے دروازے سے ویگن تک کا فاصلہ طے کیا اور ویگن کے پیچھے دبک کر گرد و پیش کا

جائزہ لیتا رہا پھر اس نے ڈرائیور سائیڈ کا دروازہ کھولا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ویگن میں داخل ہونے کے بعد اس نے سینے کے بل رینگتے ہوئے ویگن کی پوری طرح تلاشی لی۔ اس نے سیٹوں کے نیچے جھانکا، فلور میٹس کو ہٹا کر دیکھا اور ڈیش بورڈ کی تلاشی لی۔ مطمئن ہونے کے بعد وہ ڈرائیونگ سیٹ پر واپس چلا آیا۔ اس نے ویگن اسٹارٹ کی اور اس کا رخ تبدیل کردیا۔ اب ویگن کا رخ اسکول کے سامنے والے گیٹ کی طرف تھا اور وہ داخلی دروازے سے تقریباً ملی کھڑی تھی۔

چند لمحے بعد اسکول کے داخلی دروازے سے چار یرغمالی نکلے۔ ان کے پیچھے شہلا اور مشکور تھے۔ ان کے ہاتھوں میں موجود ریوالوروں کا رخ یرغمالیوں کی طرف تھا۔ یرغمالی ویگن میں بیٹھ گئے۔ ان کے پیچھے شہلا اور مشکور تھے۔

آخر میں بابر باہر آیا۔ وہ سیدھا ویگن میں نہیں گیا۔ بلکہ ٹہلتا ہوا کارنر کی طرف بڑھا۔ اس نے اسٹیڈیم کی طرف دیکھا پھر جو کچھ ہوا، وہ شہناز کے لیے قطعاً خلافِ توقع تھا۔ بابر نے رائفل بلند کی اور بہت تیزی سے اسکورنگ بوتھ کی طرف کئی فائر کیے پھر وہ پھرتی سے ویگن کی طرف آیا اور نذیر کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ویگن گیٹ کی طرف چل دی۔

○☆○

بوتھ میں موجود جلیس نے پہلے دہشت گرد کو باہر آکر ویگن میں بیٹھتے دیکھا۔ اس کے سینے میں درد ابھی نہیں تھما تھا لیکن بے بسی اور غصے نے درد کے احساس کو دبادیا تھا۔ وہ منحوس بابر کو دیکھنا چاہتا تھا اور جب بابر سامنے آیا تو وہ حیران رہ گیا۔ وہ دبلا پتلا، پستہ قامت اور بدشکل آدمی تھا۔ جس پر عام حالات میں کوئی دوسری نظر ڈالنا پسند نہ کرے۔ جلیس اتنا حیرت زدہ تھا کہ کھلا منہ لیے اسے تکنے کے سوا کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔

منحنی دہشت گرد کارنر تک آیا اور بدمعاشی کے انداز میں دونوں ٹانگیں کھول کر کھڑا ہوگیا پھر اس نے رائفل بلند کی۔ رائفل کا رُخ جلیس کی طرف تھا۔

جلیس لڑکھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹا۔ اِسی لمحے پہلی گولی بوتھ کی شیشے کی دیوار توڑ کر اندر آئی۔ وہ کرچیوں کی بوچھار کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ پیچھے ہٹتے ہوئے وہ بوکھلایا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ پیچھے رکھی میز سے ٹکرایا تو فیصلہ خود بخود ہوگیا۔ وہ لڑکھڑا کر فرش پر گرا، جہاں اب کرچیاں ہی کرچیاں تھیں۔ وہ فرش پر دم سادھے پڑا تھا۔ سینے کا درد شدت بھی پکڑ گیا تھا اور پھیلتا ہوا بائیں کندھے کے عضلات تک بھی آپہنچا تھا۔ اس کی سانس اتھلی اور تیز ہوگئی تھی۔ ہر سانس اس کے بائیں پہلو میں چاقو کی طرح گھستی محسوس ہورہی تھی۔ اس نے اٹھ کر کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن اس کوشش نے اذیت کے ساتھ مل کر اسے مفلوج سا کردیا۔ اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے اور درد کو کم کرنے کے لیے سانس لینے میں کمی کردی۔ ذرا دیر بعد درد کم ہوگیا۔ البتہ وہ اس کے کندھے کی نسوں کو اب بھی دھیرے دھیرے تھپک رہا تھا۔

اس نے اپنے پورے جسم پر ہاتھ پھیرا... یہ دیکھنے کے لیے کہ گولی کہاں پیوست ہوئی ہے۔ کافی دیر ٹٹولنے کے بعد وہ حیران رہ گیا۔ کوئی گولی اسے نہیں لگی تھی۔ وہ آہستگی سے فرش سے اُٹھا اس کے ہاتھ میں شیشے کی کرچیاں چبھی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ بالکل زخمی نہیں تھا۔

اس نے جلدی سے واکی ٹاکی اٹھایا، جس پر کوئی اسے کم از کم ایک منٹ سے پکار رہا تھا۔ "میں خیریت سے ہوں" اس نے کہا "انہیں جانے دو" پھر اس نے باہر دیکھا۔ ویگن اب گیٹ سے نکل رہی تھی۔ وہ دیکھتا رہا۔ اس کے جسم میں خفیف سی لرزش تھی۔ وہ متضاد جذبوں کے طوفان کی لپیٹ میں تھا۔ جسمانی طور پر خوف اور غصہ اسے لرزا رہے تھے اور ذہنی طور پر وہ نڈھال بھی ہورہا تھا اور اسے ہلکا پھلکا ہوجانے کا احساس بھی تھا۔ کاش... اس وقت بابر اس کے قابو میں ہوتا مگر ساتھ ہی وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اب وہ بری الذمہ ہوچکا ہے۔

○☆○

شہناز نے ویگن کو عمارت کے سامنے سڑک سے گزرتے اور پہاڑی سڑک پر نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ لوگ جارہے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ اپارٹمنٹ سے نکلے۔ بھاگتی ہوئی سڑک پر پہنچے اور ویگن کو رکنے کا اشارہ دے... کہے... مجھے بھی لے چلو۔ مجھے اکیلا کیوں چھوڑ رہے ہو؟ بابر اس کی اس وقت کی کیفیت کو سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ بابر نے اسے استعمال کیا ہے لیکن پھر بھی اسے بابر کی ضرورت تھی، پورے گروپ کی ضرورت تھی۔ اب ان لوگوں کے سوا دنیا میں اس کا تھا ہی کون۔ ان کے سوا کسی کے نزدیک اس کی کوئی وقعت نہیں تھی اور اب... اب تو وہ قاتلہ بھی تھی اور ملک کی تاریخ کے مکروہ ترین جرم میں شریک بھی۔ یہ زیادتی تھی کہ وہ اسے اکیلا چھوڑ کر جارہے تھے۔ اسے ان کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ صرف ان کے درمیان ہونا ہی اسے تحفظ کا احساس دے سکتا تھا اور اب تو اسے نذیر کے ساتھ مل کر گھر بنانا... گھر بسانا تھا۔ معصوم اور بے گناہ لوگوں کے خون میں ڈوبی ہوئی دولت کی مدد سے! اور اس گھر کا نام رکھنا تھا... خونی محل! کچھ بھی سہی، مجھے تو شاید گھر ایسے ہی مل سکتا تھا۔

ابھی ان کو گئے ہوئے صرف چند منٹ ہوئے تھے اور وہ انہیں مِس کررہی تھی۔ اس کے جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ جو کچھ ہوچکا تھا، وہ تو اب نہیں بدل سکتا تھا لیکن اب کامیابی کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ یہ ضروری ہوگیا تھا کہ بابر کو اس کے خواب کی تعبیر ملے۔ جو خون اب تک بہایا جاچکا

تھا' اسے اب صاف ستھری زندگی سے دھوکا جاسکتا تھا۔ اب یہ خون کے رشتوں سے محروم فیملی اچھی زندگی گزارے۔ بس اب اس کی یہی آرزو تھی۔

لیکن اسکول میں.... سامنے پڑی معصوم لڑکی کی لاش کو دیکھ کر اسے کچھ ہو رہا تھا۔ اس پر وحشت طاری ہو رہی تھی۔ یہ جرم بھی دُھل سکتا ہے۔ خون کے دھبے بھی صاف ہوسکتے ہیں۔ سب بے کار ہے۔ اس زندگی کو تو اب صرف موت کے دامن میں پناہ مل سکتی ہے۔ اس کے اندر دو بالکل متضاد جذبے بہت شدت اور تندی سے اُبھر رہے تھے.... آپس میں لڑ رہے تھے۔ اسے لگتا تھا کہ وہ پاگل ہوجائے گی۔

اس نے دوربین کا رخ لاش کی طرف کردیا۔ ہوا کے ہلکے جھونکے مرنے والی کے براؤن بالوں کے ساتھ چھیڑچھاڑ کر رہے تھے پھر اچانک ہر طرف سے پولیس والے اسکول میں آنے لگے۔ ان میں توقیر بھی تھا۔ اس نے پھر لاش کو اپنے سینے سے لگایا.... اور اب شاید وہ چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔

شہناز کا جی چاہا کہ وہ بھی چیخ چیخ کر رو دے۔

بوتھ میں موجود شخص میدان سے گزرتا ہوا اسکول کی طرف آرہا تھا۔ لاش اور سوگوار باپ کو نظرانداز کرکے وہ اسکول میں چلا گیا۔ ذرا دیر بعد وہ بدقسمت کلاس روم میں نظر آیا۔ وہ شیشوں سے محروم کھڑکی میں جھکا نیچے دیکھ رہا تھا۔ شہناز آگے کو جھکی۔ وہ اس کے چہرے کے تاثرات قریب سے دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کی سوچیں پڑھنا چاہتی تھی۔

اب وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ماضی پھر رہا تھا۔ کبھی اس کے پاس سب کچھ تھا.... ماں' باپ' بھائی' گھر اور اچھے مستقبل کی اُمید اور اب.... اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا اور وہ وہی سب کچھ حاصل کرنا چاہ رہی تھی مگر قانون اور اخلاق والے یہ بات نہیں سمجھ سکتے تھے۔

وہ بُری طرح چونکی۔ کھڑکی میں کھڑا شخص اب براہِ راست اسے دیکھ رہا تھا.... اور نہ جانے کب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ گڑبڑا کر کرسی سے اٹھی اور لڑکھڑاتے قدموں سے پیچھے ہٹی۔

○☆○

میدان سے گزر کر اسکول کی طرف جاتے ہوئے جلیس کو یقین ہوگیا کہ اس کے سینے میں کوئی مسل کھنچ گئی ہے۔ حرکت کے ساتھ تکلیف بڑھ رہی تھی۔ تکلیف اتنی بھی نہیں تھی کہ وہ اپنا فرض پورا نہ کرپاتا لیکن متلی کا احساس ٹھیک طرح سے کام کرنے بھی نہیں دے رہا تھا۔

وہ اسکول کی عمارت میں داخل ہوا۔ دوسری منزل تک اسے دہشت گردوں کی وحشتوں کی کوئی نشانی نظر نہیں آئی لیکن تیسری منزل کے زینوں سے جیسے وہ کسی اور ہی دنیا میں داخل ہوگیا۔ سیڑھیوں پر خون کے سوکھے ہوئے گاڑھے دھبے تھے۔ راہداری میں شیشے کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ بائیں جانب والی دیوار پر گولیوں کے کئی سوراخ تھے۔ جابجا پلاسٹر اُدھڑا ہوا تھا۔ ریسٹ روم میں سب سے زیادہ خون بہا تھا۔ یقینی طور پر کارروائی کے دوران میدانِ جنگ وہی بنا تھا۔ کھڑکیوں کی چوکھٹوں پر بھی خون کے دھبے تھے۔ باتھ روم کا حال بھی تباہ تھا۔ آئینے ٹوٹے ہوئے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ سو سے زیادہ گولیاں وہاں آئی ہوں گی۔ فیکلٹی لاؤنج مجرموں کا کمانڈ سینٹر تھا۔ وہاں جا بجا کافی کے پیپر کپ اور پیپر پلیٹس بکھری ہوئی تھیں۔ مڑے تڑے ٹشو پیپرز کا بھی ڈھیر تھا۔ ہر ایش ٹرے سگریٹ کے ٹوٹوں سے لبالب بھری ہوئی تھی لیکن اس کمرے میں فائرنگ کا کوئی نشان نہیں تھا۔ اسے بے انصافی کا احساس ہونے لگا۔

کلاس روم نمبر۲۱ میں وہ سب سے آخر میں گیا۔ اس کمرے کو دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ کمرے میں ابتری ہوگی کیونکہ یہی وہ کمرا تھا' جہاں سے یرغمالی طلبہ افراتفری کے عالم میں بھاگے ہوں گے لیکن کمرے میں بس معمولی سی بے ترتیبی تھی۔ اس کا کریڈٹ یقینی طور پر ٹیچر کو جاتا تھا۔ بچ نکلنے والے طلبا نے بتایا تھا کہ کمال رشید بدترین صورتِ حال میں بھی پُرسکون رہا تھا۔ شدید زخمی ہونے کے باوجود اس نے ہر موقعے پر ہوش مندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ کمرے کو دیکھ کر اسے طلبا کی بات پر یقین آگیا۔

وہ اس کھڑکی کے پاس رُکا' جہاں لڑکی کو شوٹ کرنے کے بعد نیچے پھینکا گیا تھا۔ وہ چند لمحے کھڑا رہا لیکن اس کی نیچے دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس نے سر داہنی طرف گھمایا اور ایک طرف نظریں جمادیں لیکن درحقیقت وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہا تھا لیکن اچانک ایک تحرک نے اس کی نظروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ اس نے تحرک کی سمت دیکھا۔ وہ ایک نوتعمیر شدہ اپارٹمنٹ ہاؤس کی کھڑکی تھی۔ شاید اس نے کوئی پردہ ہلتے دیکھا تھا۔ ہوا کی وجہ سے؟ لیکن نہیں' کھڑکی تو بند تھی۔ تو پھر؟

وہ کھڑکی سے پلٹا اور اس نے اپنے واکی ٹاکی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی تھی اور اس کے نتیجے میں سینے میں ہونے والا درد زور پکڑ گیا تھا۔ اس نے اپنی تکلیف کو نظرانداز کردیا۔ یہ امکان بہت اہم تھا کہ مجرموں کی باہر کی ساتھی کو پکڑا جاسکتا ہے۔

"انسپکٹر ارشاد.... یہ جو اس سڑک پر کشمیر ویو اپارٹمنٹس ہیں' انہیں دوبارہ چیک کیا گیا یا نہیں؟" اس نے ریڈیو میں پوچھا۔

"ہم چیک کرنے ہی والے تھے سر کہ علاقہ خالی کرنے کا حکم مل گیا۔"

"اسے پہلے چیک کیا گیا تھا؟"

"جی ہاں سر۔"

"بلڈنگ سے کوئی نکلا بھی تھا؟"

"میں لسٹ چیک کرکے بتاتا ہوں سر" دوسری طرف سے کہا

گیا پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد انسپکٹر ارشاد کی آواز اُبھری۔ "پانچ فلیٹوں کے علاوہ سب خالی تھے جناب۔ چار میں سے ہم نے لوگوں کو نکالا۔ پانچویں فلیٹ کے لوگ کہیں گئے ہوئے تھے۔ ہماری دستک کے جواب میں دروازہ نہیں کھلا۔"

"وہ کون سا فلیٹ تھا؟"

"فلیٹ نمبر تیرہ سر۔"

"تیسری منزل پر بائیں جانب والا تو نہیں.... جس کی کھڑکی یہاں سے نظر آتی ہے؟"

"میرا خیال ہے.... جی ہاں سر' یہ وہی فلیٹ ہے۔ کیوں سر....؟"

"اپنے آدمی لے کر فوراً جاؤ اور اس فلیٹ کو چیک کرو۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے اس کی کھڑکی میں کسی کو حرکت کرتے دیکھا ہے اور ہاں' محتاط رہنا.... اگر یہ وہی لڑکی ہے تو میں اسے زندہ سلامت اپنے روبرو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"بہت بہتر سر۔"

ایک لمحے سوچنے کے بعد جلیس نے کہا "ارشاد۔ میں پولیس کا مزید جانی نقصان نہیں چاہتا۔"

"ہم محتاط رہیں گے سر۔"

جلیس نے واکی ٹاکی کا بٹن دبایا اور مضطربانہ انداز میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ یہ وہی لڑکی ہوگی' جس کی آواز اس نے بابر سے بات چیت کے دوران سُنی تھی... ریڈیو پر اور وہ ان تمام مجرموں کو گرفتار دیکھنا چاہتا تھا اور یہ لڑکی ان کی گرفتاری میں کلیدی کردار ادا کر سکتی تھی۔ اس خواہش کے پیچھے انتقامی جذبہ بھی کارفرما تھا۔ مجرموں نے خود کو بہتر دہشت گرد ثابت کیا تھا۔ جبکہ وہ خود کو بہتر پولیس آفیسر ثابت نہیں کر سکا تھا۔ انہوں نے اس بات سے فائدہ اُٹھایا تھا کہ پولیس دہشت گردی کا سامنا کرنے کے لیے کبھی پوری طرح تیار نہیں ہوتی جبکہ دہشت گردوں کو اپنی دھمکیوں پر عمل کرنے میں کبھی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی اور پولیس اپنی مرضی کے مطابق آزادانہ کارروائی نہیں کر سکتی۔ اس کا بس چلتا تو اس نے یرغمالیوں کی پروا کیے بغیر عمارت پر دھاوا بول دیا ہوتا۔ جبکہ یرغمالیوں میں اس کا اکلوتا بیٹا بھی تھا۔ پہلی بار اس کے ضمیر کا بوجھ کم ہوا۔ واقعی... اس نے اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے مجرموں کے خلاف کارروائی کا منصوبہ نہیں بنایا تھا۔ بلکہ اس طرح تو اس نے اُلٹا اپنے بیٹے کی زندگی کو خطرے میں ڈالا تھا لیکن اوپر والوں کا فیصلہ کچھ اور تھا اور اب بھی اسے کئی معاملات میں جواب دہی کرنا تھی۔ اس نے مجرموں کے خلاف آپریشن کیوں کیا؟ اس نے تاوان کی رقم مجرموں کو بروقت کیوں نہیں دی؟ اس نے احکامات کی خلاف ورزی کیوں کی؟ وہ جانتا تھا کہ اس کے خلاف کارروائی ہوگی۔ مجرموں کے حصے کی سزا بھی وہ بھگتے گا۔ پبلک کے لیے بھی دہشت گردوں کے ہاتھوں معصوم لوگوں کے قتلِ عام کی اتنی اہمیت نہیں تھی جتنی پولیس کی کارروائی کے دوران خون بہنے پر پولیس کو مطعون سمجھنا تھا۔ یہی رویّہ تو دہشت گردی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ یہ کوئی نہیں سوچے گا کہ دہشت گردوں کے ہاتھوں پانچ بے گناہ افراد مارے گئے ہیں اور پھر بھی وہ آزاد ہیں بلکہ انہیں پانچ کروڑ روپے انعام بھی ملا ہے اور جس شخص نے ۳۰ گھنٹے ہر لمحے عذاب بھگتا ہے اور انسانی جانوں کو بچانے کے لیے سرمارا ہے' اسے اپنے بے داغ کیریئر کے داغدار انجام کی سزا ملے گی۔ اس پر سب لعن طعن کریں گے... اربابِ اقتدار بھی اور عوام بھی۔ اس کے ہر عمل کا.... ہر عذاب ناک لمحے کا یک طرفہ احتساب کیا جائے گا۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ۔ وہ اپنے ضمیر کی طمانیت کے لیے مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانا چاہتا تھا پھر چاہے اس کا کچھ بھی انجام ہو۔ اپنا آپ مطمئن ہوگا تو اسے کسی چیز کی پروا نہیں ہوگی۔ اس کے لیے لڑکی کا پکڑا جانا بہت ضروری تھا۔ اس سے دوسروں کے متعلق.... مجرموں کے منصوبے کے متعلق اہم معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔

○☆○

ویگن میں کمال' رئیس اور مظفر ڈرائیونگ سیٹ کے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے والی سیٹ پر مشکور شاٹ گن لیے بیٹھا تھا اور سب سے پچھلی سیٹ پر صوفیہ' شہلا کے ساتھ بیٹھی تھی۔ کمال' رئیس سے وہ چاقو طلب کرنا چاہتا تھا' جس سے پردے کاٹ کر ڈوریاں بنائی گئی تھیں۔ وہ چاقو رئیس نے اپنے پاس ہی رکھ لیا تھا لیکن مشکور آگے کی طرف جھکا بیٹھا تھا۔ کمال' رئیس سے کچھ کہتا تو وہ بھی سُن لیتا۔

کمال کو فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے بابر سے اس درجہ نفرت محسوس ہو رہی تھی کہ اس کا وجود پھنکنے لگا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن پکڑے اور اس کے وجود میں سے زندگی کی آخری رمق بھی کھینچ لے لیکن اس میں اتنی طاقت نہیں تھی اور ایسی کوشش کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ بابر نے ہر طرح سے اسے توڑ پھوڑ دیا تھا اور آخر میں نازیہ کو قتل کر کے اس نے اس کی فیصلہ کُن توہین کر دی تھی۔ اسے اپنی نظروں میں ذلیل ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

کمال کے لیے یہ یقین کرنا دشوار تھا کہ نازیہ مر چکی ہے۔ وہ فائر کی آواز سُن کر ہوش میں آیا تھا اور جیسے تیسے گرتا پڑتا باہر نکلا تھا لیکن وہ کلاس روم تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ نذیر اس کے پیچھے چلا آیا تھا اور اسے پکڑ لیا تھا۔ اس میں زیادہ مزاحمت کی طاقت بھی نہیں تھی۔ لہٰذا نذیر کو اس پر قابو پانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی پھر اس کی طبیعت بگڑ گئی تھی اور وہ نیچے گر گیا تھا۔ اس وقت بابر کلاس روم سے نکلا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی بھیانک طمانیت نظر آ رہی تھی۔ وہ اس کے سامنے آکر رکا اور مسکرایا۔ اس کا بالائی ہونٹ اوپر اُٹھا اور دانت جھانکنے لگے۔ اس وقت وہ بھیڑیا لگ رہا

تھا۔

کمال نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ اس کا گلا دبوچنا چاہتا تھا لیکن ایک تھپڑ نے اسے فرش چاٹنے پر مجبور کردیا۔ بابر اس کے سامنے تن کر کھڑا ہوگیا۔ نہ اُس نے کچھ کہا' نہ اِس نے کچھ کہا۔ بس وہ اسے ذلیل کرنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کمال کچھ کرنا چاہتا تھا مگر اس میں ہاتھ ہلانے کی طاقت بھی نہیں تھی۔

یہ خیال بہت اذیت ناک تھا کہ صورتِ حال پوری طرح بابر کے کنٹرول میں ہے۔ شیطنت' نیکی پر غالب آرہی ہے۔ یہ شخص قدم قدم پر انسانیت کی توہین کررہا ہے... اسے پامال کررہا ہے۔ معصومیت کو داغ دار کررہا ہے اور اسے روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ انسانیت اپنے اصولوں میں اتنی کمزور ہے کہ اس بھیانک شیطنت سے نہیں لڑسکتی۔

اس موقعے پر بابر نے اسے بخش دیا تھا۔ اس نے لاتوں سے..... گھونسوں سے اس کی تواضع نہیں کی تھی۔ اس نے کہا تھا "اس کے بعد تمہاری باری ہے" اور پھر وہ چلا گیا تھا اور کمال جانتا تھا کہ اس نے سچ کہا ہے۔

اس کے بعد بے بسی کے احساس نے اس کے ذہن کو جکڑ لیا تھا۔ اس کی کمزوری میں اضافہ ہوگیا تھا۔

انہوں نے دونوں لڑکوں کے ایک ایک ہاتھ کو ملا کر رسی سے باندھ دیا تھا پھر انہوں نے ڈائنا مائٹ اسٹکس کا ایک پیکٹ رئیس کی کمر سے باندھ دیا تھا۔ رسی کی گرہیں ایسی باندھی گئی تھیں کہ طویل کوشش کے بغیر انہیں کھولا نہیں جاسکتا تھا۔ دوسرا پیکٹ انہوں نے اس کی پشت سے باندھ دیا تھا۔ صوفیہ کے بھی ہاتھ باندھ دیے گئے تھے۔ ٹریگر ڈیوائس فرنٹ سیٹ پر بیٹھے بابر کی گود میں رکھی تھی۔ اس نے ان لوگوں کو انسانی بم میں تبدیل کردیا تھا۔ اس نے واضح کردیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہوئی تو وہ صرف ایک بٹن دبائے گا اور ان کے چیتھڑے اُڑ جائیں گے۔

کمال کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ ایسی بے بسی تو اس نے جنگی قیدیوں کے بھارتی کیمپ میں بھی نہیں محسوس کی تھی۔ جسمانی اذیت بھی کچھ کم نہیں تھی۔

وہ راولپنڈی کی حدود میں داخل ہوگئے تھے۔ ذرا دیر بعد ائرپورٹ کی بلڈنگ نظر آنے لگی تھی۔ دور رن وے پر ایک اکیلا طیارہ کھڑا تھا۔ رن وے کی طرف جانے والا راستہ صاف تھا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا۔

○☆○

شہناز نے سٹنگ روم میں پوزیشن سنبھال لی تھی۔ وہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کررہی تھی کہ اسے نہیں دیکھا گیا ہے۔ اس نے ریڈیو کو ٹرائی کیا اور دیر تک بابر کو پکارتی رہی۔ اسے یقین تھا کہ وہ جواب دے گا۔ اسے دلاسہ دے گا اور سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا لیکن ریڈیائی لہروں کی سرسراہٹ کے سوا اسے کوئی آواز نہیں سنائی دی۔

پھر اسے خیال آیا کہ ویگن اب تک یقیناً دور نکل چکی ہوگی۔ اب ریڈیو پر رابطہ ممکن نہیں۔ اب وہ اکیلی ہے۔ وہ اٹھ کر بیڈ روم میں چلی گئی۔ بیڈ اور دیوار کے درمیان دبک کر اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ اس طرح کی صورتِ حال کے لیے بابر نے اسے کیا ہدایات دی تھیں۔

"ہم میں سے کسی کو بھی زندہ پولیس کے ہاتھ نہیں آنا چاہیے" اس کی سماعت میں بابر کے الفاظ گونجے۔

اس وقت شہناز نے یہ عہد کرلیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اب اس کا جینا مرنا اس گروپ کے ساتھ ہے۔ وہ سب ساتھ جئیں گے' ساتھ مریں گے لیکن اب معاملہ مختلف تھا۔ اگر سب مر رہے ہوتے تو زندگی اسے بے کار شے محسوس ہوتی لیکن اب وہ سب محفوظ تھے اور وہ خود اکیلی بھی تھی اور خطرے میں بھی۔ اس نے بیلٹ سے ریوالور کھینچا اور عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔ یہ وہی ریوالور تھا جس سے اس نے ایک معصوم شخص کو قتل کیا تھا۔ جو اپنی بیوی کے ساتھ فلم دیکھ کر سنیما سے باہر نکل رہا تھا۔ اس وقت وہ قتل ضروری معلوم ہوا تھا۔ اس کے بغیر وہ گروپ میں شامل نہیں ہوسکتی تھی لیکن اب... اب اسے یقین نہیں رہا تھا۔ اب وہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ کسی پر گولی چلاسکتی ہے۔ اب وہ سوچ رہی تھی' کاش ایسی نوبت ہی نہ آئے۔

فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کلاس روم نمبر ۲۱ کی کھڑکی میں کھڑے شخص نے اسے دیکھا ہے یا نہیں پھر وہ تو خاص طور پر اس طرف دیکھ رہی تھی... اس شخص کو لیکن وہ شخص تو خصوصیت سے اسے نہیں دیکھ رہا ہوگا۔ اس شخص کے سامنے تو ایک پھیلا ہوا منظر تھا اور وہ کھڑکی سے ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑی تھی... اور زیادہ روشنی بھی نہیں تھی۔ غروبِ آفتاب کا وقت تھا۔ آسمان پر گھٹا بھی تھی۔ اس کے باوجود یہ ناممکن نہیں کہ دوربین کے شیشوں سے ہلکی روشنی منعکس ہوگئی ہو۔

یہ سب کچھ سوچ کر وہ خاصی مطمئن ہوگئی۔ اس حد تک کہ وہ محتاط انداز میں ہی سہی' بیڈ روم سے باہر چلی آئی۔ وہ سٹنگ روم میں آئی لیکن فوراً ہی دہشت زدہ بھی ہوگئی۔ دروازے کا لٹو کھڑکھڑایا... پھر گھوما۔ اس نے ریوالور بلند کیا اور اس کا رخ دروازے کی طرف کردیا۔

اس کے بعد کیا ہوا' وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ دروازہ دھماکے سے اس قدر اچانک کھلا کہ اس کے حلق سے بے ساختہ چیخ نکل گئی لیکن اس نے دروازہ کھلنے کی آواز نہیں سنی۔ کیونکہ اس سے پہلے ہی وہ ٹریگر دبا چکی تھی اور وہ ٹریگر دباتی چلی گئی۔ اسے اندازہ تھا کہ کئی افراد قلابازیاں کھاتے ہوئے اندر گھسے ہیں۔ سب کچھ دھندلا گیا تھا۔ رنگین شعلے رقص کررہے تھے۔ فائرنگ کا شور سماعت معطل کردینے والا تھا۔ اس نے اپنی چیخ سنی۔ ایک گولی اس

کے جسم میں اُتر گئی تھی۔ وہ پیچھے کی طرف پہلو کے بل گری۔ دیوار جیسے خود اس کی طرف جھپٹی اور اس سے ٹکرائی تھی۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا۔ اس نے خود کو گرنے سے روکنے کی کوشش کی لیکن فرش کے جھپٹنے کی رفتار بہت تیز تھی اور جھٹکا بہت شدید تھا۔

○☆○

نذیر نے ویگن کو تیز رفتاری سے موڑ کر گیٹ سے گزارا۔ کمال کا زخمی کندھا برابر بیٹھے ہوئے مظفر سے ٹکرایا۔ درد کی ایک مہیب موج اسے ڈبو گئی۔ ویگن اب رن وے کی طرف دوڑ رہی تھی۔ کمال نے بڑی جدوجہد کے بعد اپنا زخمی کندھا ہٹایا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے کھڑکی سے دیکھا۔ ویگن کی رفتار بہت تیز تھی اور اس کا رخ سیدھا جہاز کی طرف تھا۔ جبکہ رن وے کی طرف کوئی سڑک نہیں جاتی تھی، نذیر ویگن کو کچے میں تیز رفتاری سے دوڑا رہا تھا۔ جھٹکے بہت شدید تھے۔

ایک اور جھٹکا لگا۔ ویگن ایک لمحے فضا میں معلق رہی اور پھر رن وے پر دوڑنے لگی۔

بالآخر ویگن رک گئی۔ کمال نے سکون کی سانس لی۔ نذیر نے انجن بند کیا۔ وہ چند منٹ ویگن میں بیٹھے رہے۔ بابر جہاز کے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا پھر اس نے مشکور کو حکم دیا کہ وہ جا کر جہاز کو چیک کرے پھر اس کی ہدایت پر شہلا صوفیہ کو آگے لے آئی اور اس نے صوفیہ اور کمال کے ایک ایک ہاتھ کو ویسے ہی باندھ دیا، جیسے مظفر اور رئیس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ کمال کا بایاں ہاتھ صوفیہ کے داہنے ہاتھ سے باندھا گیا تھا اور یہ بات تکلیف دہ تھی۔

"ذرا سا بائیں جانب ہٹ جاؤ" کمال نے کراہتے ہوئے صوفیہ سے کہا۔

وہ بائیں جانب ہٹ گئی "بہت تکلیف ہو رہی ہے؟"

کمال نے پہلو بدلا اور قدرے پُرسکون ہو گیا "پہلے کے مقابلے میں تو بہت کم ہے" اس نے جواب دیا۔

وہ اسے غور سے دیکھنے لگی "تم ٹھیک تو ہو نا؟"

وہ بہت خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ کمال کو احساس ہوا کہ اس کا چہرہ کتنا زرد ہو گیا ہے۔ اس کے رخسار بھی اندر کو دھنس گئے تھے۔ لگتا تھا، اس کا وزن بھی کم ہوا ہے۔ تمام دن وہ خاموش رہی تھی اور وہ اب وجہ بھی سمجھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کا خالی پن اور ویرانی بتا رہی تھی کہ وہ شاک کی حالت کے بہت قریب پہنچ چکی ہے۔

"کمال... اس نے نازیہ کو مار ڈالا" صوفیہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے آنسوؤں سے بھر گئیں۔ کمال نے حیرت سے سوچا... یہ تو اپنی عمر سے بڑی لگ رہی ہے۔ وہ پرانی صوفیہ تھی ہی نہیں۔ اس کے بالوں کی چمک ماند پڑ چکی تھی اور اب وہ چپکے ہوئے تھے۔ آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے تھے۔ اسے اس پر ترس آنے لگا۔ وہ اسے چھونے کے لیے ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے رُک گیا۔ جو کچھ ہوا تھا، اس نے ان کے درمیان ایک دوری سی پیدا کر دی تھی... ایک بے نام سی کشیدگی۔ وہ اس سے کچھ دور ہو گیا۔

"میرا خیال ہے صوفیہ، اب ہمیں اس امکان کو قبول کر لینا چاہیے" وہ بولا "... کہ یہ لوگ ہم سب کو قتل کر دیں گے۔" اس کے لہجے میں سفاکی تھی "مجھے یقین نہیں کہ ہم انہیں روک سکیں گے۔ مجھے بھی نازیہ کی موت کا دکھ ہے، لیکن فی الحال میں اس دکھ میں ڈوبنا نہیں چاہتا۔ ابھی ہمیں اپنے تحفظ کے متعلق سوچنا ہے۔"

اسے احساس تھا کہ یہ محض خالی خولی، کھوکھلے لفظ ہیں۔ اس کے پاس تحفظ کے متعلق سوچنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ کوئی امکان، نہ کوئی خواب۔

صوفیہ نے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ وہ تو نازیہ کے خیال میں ہی گم تھی "ہمیں ہر حال میں اسے پہلے نکال دینا چاہیے تھا" وہ بڑبڑائی۔

"صوفیہ، تم بھول رہی ہو کہ اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ وہ اس مرحلے سے گزر ہی نہیں سکتی تھی۔ گر کر مر جاتی" کمال نے تحمل اختیار کرنے کی کوشش کی "یہ خواہ مخواہ ضمیر پر بوجھ لادنے کا وقت نہیں ہے۔"

اس وقت مشکور واپس آیا اور اس نے ان لوگوں کو ویگن سے اُترنے کا اشارہ کیا۔

ویگن سے اُترتے ہوئے کمال نے پولیس کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ بابر نے جہاز کے لیے بہت محفوظ جگہ منتخب کی تھی۔ وہ رن وے کا دور دراز کا حصہ تھا۔ اردگرد کا کم از کم آدھا میل کا حصہ پوری طرح نظروں کے سامنے تھا اور وہاں کسی کے چھپنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے اتنے فاصلے سے فائر کرنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔ سرپرائز اٹیک کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔ بابر کارروائی کے لیے پیش قدمی کرنے والوں کو دور سے ہی دیکھ سکتا تھا۔

"یعنی صورتِ حال اس قدر مایوس کن ہے۔ کیا ان لوگوں کو روکنے کی کوئی کوشش تک نہیں کی جائے گی؟" کمال نے اداسی سے سوچا۔

○☆○

ایس پی جلیس جانتا تھا کہ وقت اس کے ہاتھوں سے پھسلا جا رہا ہے۔ وہ دوڑتا ہوا سیڑھیاں چڑھ رہا تھا لیکن یہ احساس بہت توانا تھا کہ کچھ بھی حاصل نہیں ہو گا۔ لینڈنگ پر وہ رکا اور اس نے دُکھتے ہوئے سینے کو ہاتھ سے دبایا لیکن وہ رک نہیں سکتا تھا۔ اس نے اتنے فائروں کی آواز سنی تھی کہ لڑکی کا زندہ ہاتھ لگنا ناممکن ہی نظر آ رہا تھا۔ کاش... کاش...!

وہ فلیٹ میں داخل ہوا تو اسے لڑکی سٹنگ روم میں دور کی دیوار کے پاس بکھری نظر آئی۔ اس کے دل کو جھٹکا لگا۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ اس نے کرسی کا سہارا لیا اور خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے دل کی حالت اچھی نہیں ہے۔

پھر اسے ایک امید افزا بات نظر آئی۔ لڑکی سانس لے رہی تھی!

انسپکٹر ارشاد اس کی طرف بڑھا۔ وہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "آپ ٹھیک تو ہیں سر!" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

جلیس نے کرسی سے ہاتھ ہٹایا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔ "میں ٹھیک ہوں" اس نے کہا "یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

انسپکٹر نے لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس نے ہمیں موقع ہی نہیں دیا سر۔ اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ مجبوراً ہمیں گولی چلانی پڑی۔"

جلیس اب خود کو سنبھال چکا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل شہناز کے پاس بیٹھ گیا۔ اسے حیرت ہوئی۔ لڑکی کم عمر بھی تھی اور خوب صورت بھی۔ عام طور پر ایسے کاموں میں ملوث ہونے والی لڑکیوں کے چہروں پر کرختگی نظر آتی ہے' نرمی اور خوب صورتی نہیں۔ "تم نے ایمبولینس منگوائی ہے؟" اس نے انسپکٹر سے پوچھا۔

"جی ہاں سر۔"

جلیس نے زخم کا جائزہ لیا۔ گولی پہلو میں لگی تھی اور باہر نہیں نکلی تھی۔ ورنہ دوسرا زخم بھی نظر آتا.... گولی کے باہر نکلنے کا اور اتنے کم فاصلے سے چلائی جانے والی گولی کو بہرحال باہر نکلنا چاہیے تھا۔ نہ نکلنے کا مطلب یہ تھا کہ گولی جسم کے اندر کسی ٹھوس چیز سے ٹکرائی ہے۔

"فائر کرتے وقت تم کہاں تھے؟" اس نے انسپکٹر ارشاد سے پوچھا۔

"وہاں... فرش پر گرا ہوا تھا" انسپکٹر نے اشارے سے بتایا۔

"اور لڑکی اس جگہ کھڑی تھی...؟"

"دیوار سے ذرا آگے..."

"تو گولی ترچھی اور اوپر کی سمت گئی ہوگی" جلیس نے کہا۔ وہ گولی سے پہنچنے والے نقصان کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ گولی جگر سے یا داہنی جانب کے گردے سے ٹکرائی ہوگی اور اوپر اُٹھتے ہوئے معدے سے گزر کر بائیں پھیپھڑے میں گھسی ہوگی۔ یعنی پسلیوں کے عقبی پنجر میں اُلجھ گئی ہوگی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے بہت زیادہ نقصان پہنچایا تھا۔ اس نے لڑکی کا ہاتھ تھام کر دیکھا۔ نبض بہت کمزور تھی۔ سانسیں بھی اتھلی تھیں۔

لڑکی کے بچنے کا امکان بہت ہی کم تھا۔

"میں اسکول واپس جا رہا ہوں" اس نے انسپکٹر سے کہا "تم اسے اسپتال لے کر جاؤ۔ ڈاکٹر سے کہنا کہ میرا اس سے بات کرنا ضروری ہے۔ وہ کچھ بھی کرے۔ مجھے اس سے جلد از جلد بات کرنی ہے۔"

"اوکے سر"

وہ دروازے کی طرف بڑھا لیکن باہر نکلتے نکلتے رک گیا۔ صوفے پر اسے ریڈیو پڑا نظر آیا۔ اس نے ریڈیو اٹھایا اور کھڑکی کی طرف چل دیا۔ کھڑکی کے سامنے کرسی پڑی تھی۔ کرسی پر ایک دوربین اور ایک نائٹ اسکوپ رکھا تھا۔ اس نے کھڑکی میں کھڑے ہو کر اسکول کی طرف دیکھا۔ اس کی نظریں اسٹیڈیم سے ہوتی ہوئی اسکول کی عمارت کی طرف بڑھیں۔ بابر نے یقینی طور پر بہت اچھے فلیٹ کا انتخاب کیا تھا۔ یہ مسئلہ حل ہو گیا کہ اس کا منصوبہ عین موقعے پر کیوں ناکام ہوا۔ لڑکی نے نائٹ اسکوپ کی مدد سے اسکول کی چھت پر جوانوں کو دیکھا ہوگا اور ریڈیو کے ذریعے بابر کو خبردار کر دیا ہوگا۔

اس نے ریڈیو بھی کرسی پر رکھ دیا اور فلیٹ سے نکل آیا۔

وہ اسکول پہنچا' جہاں لڑکی کی لاش اٹھائی جا چکی تھی۔ بم ڈسپوزل اسکواڈ والوں نے ایک زینے سے بندھا ہوا ڈائنا مائٹ چارج کھول کر اسے بے کار بنا دیا تھا۔ یہ چارج مجرم چھوڑ گئے تھے۔ باقی دونوں چارجز وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ وہ دوبارہ تیسری منزل کی طرف چل دیا۔ اس اُمید پر کہ شاید وہاں اسے کوئی سراغ مل جائے۔ جس سے کچھ مدد مل سکے لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

نیچے آنے سے پہلے اس نے بم ڈسپوزل اسکواڈ والوں سے بات چیت کی۔ انہوں نے اسے چارج کے متعلق تفصیل سے بتایا۔ وہاں سے وہ نیچے پرنسپل کے کمرے میں آیا۔ اسے ایک فون کرنا تھا۔ وہاں... پرنسپل جمیل الرحمان کو بیٹھے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ اس نے کرسی گھسیٹی اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

جمیل الرحمان چند لمحے اسے بغور دیکھتا رہا "تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔ کیا بات ہے؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔ بس تھکن ہے۔"

"ہاں... آرام کی ضرورت تو ہم سبھی کو ہے اور سناؤ' وہ لڑکی پکڑی گئی؟"

جلیس نے سگریٹ سلگا کر ایک گہرا کش لیا "ہاں' لیکن میرا خیال ہے' وہ زیادہ دیر جی نہیں سکے گی۔"

"اوپر کوئی کام کی چیز ملی؟"

"نہیں' کچھ بھی نہیں۔"

جمیل الرحمان بھی تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں اُبھر آئی تھیں لیکن وہ خوش تھا کہ اسکول کی عمارت سے وبال ٹل گیا ہے۔ جلیس کو وہ اچھا لگا تھا۔ وہ اس سے مرنے والی طالبہ کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے محسوس کر لیا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ پرنسپل سمجھ دار آدمی تھا۔ وہ ذمے داری سمجھتا تھا اور جانتا تھا کہ جلیس جو کچھ کر سکتا تھا' وہ اس نے

کیا ہے لیکن کامل تو کوئی انسان نہیں ہوتا۔

"چلیں... آپ کو آپ کا اسکول مل گیا" اس نے کہا۔

"لیکن ابھی کلاسیں نہیں ہو سکیں گی۔ اسکول کھلنے میں دو تین دن لگیں گے" جمیل الرحمان نے کہا "کھڑکیوں میں نئے شیشے لگوانے ہیں۔ دُھلائی اور صفائی کرانی ہے۔ بعض کمروں میں دوبارہ رنگ و روغن کرانا ہوگا۔ جن دیواروں میں گولیوں کے سوراخ ہوئے ہیں' وہاں پلاسٹر کرانا ہوگا۔ اس کے باوجود تین چار دن تک یہاں کی فضا نارمل نہیں ہو سکے گی۔ ایسے المیوں کا تاثر آسانی سے نہیں مٹتا۔ بد قسمت کلاس کے طلبا کو تو میں نے دو ہفتے کی چھٹی دے دی ہے۔ تمہارا بیٹا بھی دو ہفتے گھر پر ہی رہے گا۔"

جلیس نے سگریٹ سے سگریٹ سُلگائی "یہ ہے تو اس کی بہتری کے لیے" وہ بولا "لیکن نعمان مجھے یقین ہے کہ اسے پسند نہیں کرے گا۔ یہ تو اس کے لیے توجہ کا مرکز بننے کا موقع تھا۔"

جمیل الرحمان نے اسے دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں اور میز پر رکھے کاغذات کی طرف متوجہ ہوگیا۔

چند لمحے خاموشی رہی پھر جلیس نے کہا "لڑکی کا باپ آگیا تھا۔ مجھے اس سے ملاقات بھی کرنی ہے۔"

"میں اس سے مل چکا ہوں۔ تمہارے لیے یہ ایک دشوار مرحلہ ہوگا۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں ہوا؟ ہوا تو ان کے بچّوں کے ساتھ کیوں ہوا؟ اور مجرموں کو روکا کیوں نہیں جاسکا؟"

جلیس نے سگریٹ بُجھائی اور اٹھ کھڑا ہوا "مجھے معلوم ہے' اس کہانی کا ولن تو میں ہی ہوں" اب وہ کمرے میں ٹہل رہا تھا "میں ان لوگوں سے یہیں نمٹ لینا چاہتا تھا۔ میں تمام بچّوں کو زندہ سلامت نکال لینا چاہتا تھا۔ میرے پاس دو ہی راستے تھے۔ کچھ کروں یا کچھ بھی نہ کروں؟ اور کمال یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں میری کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں ہمیشہ تنقید کا نشانہ بنتا رہوں گا..." وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ خود ترسی میں مبتلا ہو رہا ہے۔

"میں جانتا ہوں کہ تم نے ہر ممکن کوشش کی اور بے حد خلوص سے کی" جمیل الرحمان نے پوری سچائی سے کہا "لیکن تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں نے اب تک متاثرہ طلبا کے جتنے والدین سے بات کی ہے' وہ سب پولیس کو ذمّے دار ٹھہرا رہے ہیں۔ اس میں میڈیا کی کوریج کا بھی دخل ہے' جو پولیس پر اندھا دھند تنقید کو فرض سمجھتے ہیں۔"

جلیس پھر بیٹھ گیا اور سگریٹ سُلگالی "میں جانتا ہوں۔ میرے دونوں اقدامات کو تنقید کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ کہا جارہا ہے کہ عمارت پر دھاوا بولنا غیر ضروری رسک تھا اور تاوان کی ادائیگی کو ٹال کر مہلت حاصل کرنے کی کوشش حماقت بھی تھی اور حکم عدولی بھی لیکن میں جانتا ہوں کہ دونوں میں سے ایک کوشش بھی کامیاب ہو جاتی تو میں اس وقت ہیرو ہوتا' بہرحال میں حقیقت پسند آدمی ہوں۔ میں نے جوا کھیلا تھا اور ہار گیا۔ اب قربانی کا بکرا بھی میں ہی بنوں گا' حکومت بھی اپنی بے اصولی کی ذمے داری مجھ پر تھوپ دے گی۔"

جمیل الرحمان نے بے حد خلوص سے کہا "میں اگر کسی بھی طرح تمہارے کام آسکتا ہوں تو ضرور بتاؤ' مجھے خوشی ہوگی۔"

جلیس نے مسکرانے کی کوشش کی "پیش کش کا شکریہ۔ یہ زخمی لڑکی میری آخری اُمید ہے' دعا کریں کہ میں اس سے معلومات اُگلوا سکوں۔ ورنہ میں جانتا ہوں کہ مجھے فٹ بال بنا دیا جائے گا۔ بہرحال میں اسے بھی جھیل جاؤں گا۔ ہم پولیس والے بڑی موٹی کھال کے ہوتے ہیں۔ ارے ہاں... مجھے یاد آیا۔ میں یہاں ایک فون کرنے آیا تھا۔ اجازت ہے؟"

"ضرور۔"

جلیس نے نمبر ڈائل کیا۔ اپنے پُراعتماد لہجے کے برعکس وہ بہت پریشان تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ احتساب کا خوف کتنا خوف ناک ہوتا ہے۔ دوسری طرف سے سنائی دینے والی آواز نے اس کی سوچوں کو منتشر کردیا۔ "لیفٹیننٹ سعید اسپیکنگ۔"

"انسدادِ دہشت گردی اسکواڈ سے؟ سنو میں ایس پی جلیس احمد بول رہا ہوں۔ میجر نصیر سے بات کراؤ۔"

چند لمحے بعد ریسیور پر میجر نصیر کی آواز ابھری "یس مسٹر جلیس۔ کیا صورت حال ہے؟"

"اسکول کی عمارت سے کوئی کام کی چیز نہیں ملی ہے۔"

"مجھے ایکسپلوزیوز کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟"

جلیس نے پنسل اٹھائی اور میز پر رکھے سادہ کاغذ پر یونہی لکیریں کھینچنے لگا "ہر چارج میں ڈائنا میٹ کی پندرہ اسٹکس کو جوڑا گیا ہے اور وہ ریڈیو کنٹرول ڈیوائس سے منسلک ہیں" اس نے کاغذ پر بڑا سا ۱۵ لکھا "بم ڈسپوزل والوں کا خیال ہے کہ وہ ریموٹ کنٹرول ٹریگر استعمال کر رہے ہیں' جیسا ہم لوگ ٹی وی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بم پھٹنے میں ذرا دیر نہیں لگے گی۔ یہ بڑا ڈھیلا ڈھالا سیٹ اپ ہے۔"

"یہ تو کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ اور کچھ؟"

"ہم نے ان کی ساتھی لڑکی کو پکڑ لیا ہے' جو قریب کی ایک بلڈنگ سے اسکول پر نظر رکھے ہوئے تھی۔"

"کچھ معلوم ہوا اس سے؟"

"نہیں۔ گرفتاری کے عمل میں وہ زخمی ہوگئی تھی گولی لگی ہے اسے۔"

"یہ بھی بُری خبر ہے۔ تو ان لوگوں کے متعلق کوئی خاص بات نہیں بتا سکتے؟"

"جو کچھ مجھے معلوم ہے' تم بھی جانتے ہو۔ یہ لوگ چالاک اور خطرناک ہیں۔ اب تک پانچ افراد کو قتل کرچکے ہیں اور ہماری ہر

کوشش کو ناکام بنا چکے ہیں۔"
"ہم کوئی کارروائی نہیں کرسکتے؟"
جلیس نے کاغذ پر بڑے حروف میں "ناممکن" لکھا "سنو.... جس لڑکی کو ہم نے پکڑا ہے، اس نے بھی مزاحمت کی۔ اس لیے ہمیں گولی چلانی پڑی۔ میں سمجھتا ہوں کہ کارروائی کی گئی تو وہ جہاز کو اُڑا دیں گے۔ ان کا انداز غیر ملکی تخریب کاروں کا سا ہے۔ یہ زندہ گرفتار نہیں ہونا چاہتے۔"

"کیسی بے بسی ہے۔ تم اپنی بے بسی مجھے بھی منتقل کر رہے

"نہیں۔ اپنے تجربے کی روشنی میں تمہیں متنبہ کر رہا ہوں۔ تم سوچو گے کہ مناسب موقع مل جائے تو تم ان پر قابو پا سکتے ہو لیکن میں بتا رہا ہوں کہ یہ تباہ کن ہوگا اور ایک مشورہ اور... اوپر کے احکامات کی خلاف ورزی نہ کرنا۔"

"یہ بھی اپنے تجربے کی روشنی میں کہہ رہے ہو؟"

"ہاں۔"

"یعنی انہیں عافیت سے نکل جانے دوں؟"

"سنو میجر۔ تمہاری طرح میں بھی یہ نہیں چاہتا کہ وہ صاف بچ نکلیں لیکن میں نہیں چاہتا کہ میرے ساتھ کوئی اور بھی قربانی کا بکرا بنے" جلیس نے بے حد خلوص سے کہا۔

"مشورے کا شکریہ" دوسری طرف سے میجر نصیر نے سرد لہجے میں کہا "یہاں کی صورتِ حال میرے سامنے ہے۔ میں دیکھ بھال کر اپنے طور پر فیصلہ کروں گا۔"

"گڈ لک۔ میں اب اسپتال جا رہا ہوں۔ معلومات حاصل ہوئیں تو تمہیں رِنگ کردوں گا۔"

"سنو مسٹر جلیس.... میں جانتا ہوں کہ تم نے بہت کڑا وقت گزارا ہے لیکن موقع ملے تو یہاں چلے آؤ۔"

جلیس اس پیش کش پر حیران رہ گیا "شکریہ میجر۔ میں کوشش کروں گا۔"

ریسیور رکھ کر وہ جمیل الرحمان کی طرف پلٹا "مجھے لگتا ہے کہ ساری دنیا میری مخالف ہو گئی ہے" اس نے کہا "کچھ فیصلے.... ناگزیر فیصلے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے بعد آدمی مسلسل اس احساس سے دوچار رہتا ہے۔ مجھے آپ پر رشک آتا ہے سر۔ آپ کی پریشانیاں تو ختم ہو چکیں۔"

جمیل الرحمان نے سر اُٹھا کر اسے دیکھا "پریشانیاں اتنی آسانی سے ختم نہیں ہوتیں۔ ہاں، ان کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ دیکھو، مجھے اس عمارت کو ٹھیک ٹھاک کرانا ہے پھر مجھے اسکول کی سیکیورٹی کے لیے کچھ سوچنا ہوگا۔ یہاں بڑے بڑے لوگوں کے بچّے پڑھتے ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ یہیں پڑھتے رہیں۔ کچھ لوگوں کے خیال میں یہ واقعہ اسکول کی بدنامی کا باعث بھی ہوا ہوگا۔ پریشانیاں میرے لیے بھی ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ جب تک باقی چاروں بھی رہا نہ ہو جائیں، میری پریشانیاں ختم نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا مجھ پر رشک نہ کرو۔"

جلیس کو شاک لگا۔ ان چاروں کا تو اسے دھیان بھی نہیں تھا۔ بھول گیا تھا انہیں۔ صرف اس لیے کہ اب وہ اس کی ذمے داری نہیں تھے!

○☆○

کیپٹن نوید حسن بوئنگ ۷۳۷ کے کنٹرول کے عقب میں بیٹھا تھا۔ وہ حیران تھا کہ دہشت گردوں نے اس جہاز کا ہی انتخاب کیوں کیا۔ اسے اس قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے امریکا میں خصوصی تربیت دی گئی تھی۔ وہ اس طرح کے کئی بین الاقوامی معاملات نمٹا چکا تھا لیکن پاکستان میں یہ اس کی آزمائش کا پہلا موقع تھا۔

ویسے نوید نے اس بات کو اتنی اہمیت نہیں دی۔ اس کا خیال تھا کہ بیشتر دہشت گردوں کو اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اسے اس بات سے فائدہ اٹھانے کی تربیت دی گئی تھی۔ وہ کئی بار ایسے جہاز اڑا چکا تھا اور جانتا تھا کہ آخر میں دہشت گرد بوکھلا جاتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ ایسے میں ان پر آسانی سے قابو پا لیا جاتا ہے۔

اسے بس یہ فکر تھی کہ بوئنگ ۷۳۷ اس نے کم ہی اُڑایا تھا۔ عام طور پر وہ زیادہ بڑے یا پھر بہت چھوٹے جیٹ اُڑاتا رہا تھا۔ عام طور پر وہ بوئنگ ۷۴۷ اُڑاتا تھا۔ وہ اس کی مشینری سے پوری طرح واقف تھا اور اس پر اس کا کنٹرول ہوتا تھا۔ یہ اس کے لیے ایک اہم بات تھی۔

وہ ائرفورس سے ریٹائر ہو چکا تھا۔ وہاں اس نے کئی کارنامے انجام دیے تھے۔ وہ بہت مہم جو اور خطر پسند پائلٹ تھا اور بعد میں اپنے ایڈونچرز کے متعلق دوسروں کو بتاتا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ ایسی کسی مہم کے دوران وہ مر بھی سکتا ہے، اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

جسیم اور تنومند مشکور شاٹ گن لیے جہاز میں آیا تو اس نے اس کی طرف توجہ بھی نہیں دی۔ اس نے انسدادِ دہشت گردی کے چیف کو پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ سیٹ کے نیچے ٹیپ کی مدد سے کوئی ریوالور نہیں چپکایا جائے گا۔ عملے میں کوئی جعلی فرد شامل نہیں ہوگا۔ جہاز میں کسی کو چھپایا بھی نہیں جائے گا۔

"آپ کو دہشت گردوں سے نمٹنے کے لیے جو کچھ کرنا ہے، باہر کرلیں۔" اس نے چیف سے کہا تھا "لیکن یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ ان کے جہاز پر سوار ہونے کے بعد آپ کا کھیل ختم ہو جائے گا۔ میں جہاز کو اور اپنے عملے کو خطرے میں ڈالنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ میں جہاز اُڑاؤں گا اور اپنے عملے اور یرغمالیوں کے تحفظ کے لیے جو کرسکا، ضرور کروں گا مگر آپ جہاز کے اندر کوئی اسکیم نہیں بنائیں گے۔"

یہی وجہ تھی کہ وہ پُراعتماد تھا۔ پائلٹ تو وہ تھا ہی لیکن اسے یقین تھا کہ وہ دہشت گردوں سے نمٹ سکتا ہے۔ وہ صرف نفسیاتی دباؤ کا قائل تھا۔ اس نے سر گھما کر مٹکور کو دیکھا اور اسے ویسے مخاطب کیا' جیسے اپنے عام مسافروں کو خراب موسم میں دلاسہ دیتا تھا "میرا خیال ہے' مسافروں کو بٹھاؤ اور چل دو۔ اس سے پہلے کہ قانون نافذ کرنے والوں کی نیت تم پر خراب ہو۔"

مٹکور اس قسم کے معاملات میں تابعداری کا قائل تھا۔ اس نے سر کو تفہیمی جنبش دی اور کیبن سے نکل گیا۔

نوید نے اپنے کو پائلٹ کو دیکھا اور مسکرا دیا "یہ تو بڑا بیبا بندہ معلوم ہوتا ہے" اس نے تبصرہ کیا "دیکھو نا' کوئی پھوں پھاں کیے بغیر چلا گیا۔"

لیکن بعد میں اندر آنے والے منحنی جسم کے پستہ قامت شخص نے اسے بہت زیادہ متاثر کیا۔ اس کے چہرے پر سختی اور بے رحمی تھی۔ جسم دُبلا لیکن گھٹا ہوا تھا۔ اپنی آنکھوں اور چہرے سے قطع نظر وہ غیر اہم اور عام سا آدمی تھا اور نوید کا تجربہ تھا کہ ایسے لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں ہر لمحے الرٹ رہنا پڑتا ہے۔ یہ شخص اسے اچھا نہیں لگا۔ اپنی ظاہری شخصیت کی وجہ سے نہیں' جو بلاشبہ بدنما تھی۔ بلکہ اس لیے کہ وہ اسے تنگ نظر اور آدم بیزار لگا تھا۔ یہ خرابی نوید کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ خود بھی ایسا ہی تھا۔

اس نے فیصلہ کیا کہ غیر جانبدار رویے کا مظاہرہ کرے گا۔ شاید اس طرح صورتِ حال کچھ بہتر ہو جائے۔ چنانچہ اس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا "ویلکم آن بورڈ۔ میں نوید حسین ہوں... تمہارا پائلٹ۔"

بابر نے بے تاثر نظروں سے اسے دیکھا "میں بابر ہوں... تمہارا دہشت گرد' تمہارا آقا۔"

نوید نے اسے غور سے دیکھا۔ ہونٹوں کی بناوٹ بتاتی تھی کہ وہ حسِ مزاح سے محروم ایک سفاک شخص ہے۔ "خیر... مجھے کیا' اس نے سوچا مجھے اس کے ساتھ عمر بھر تو نہیں رہنا ہے" لیکن یہ طے تھا کہ اس شخص کا تذکرہ اس کہانی میں جان ڈال دے گا' جو نوید کو مشن کی تکمیل کے بعد اپنے دوستوں کو سُنانا تھی۔ وہ بحران میں پُرسکون رہنے والا' اور دماغ کو ٹھنڈا رکھنے والا آدمی لگتا تھا اور یہ اچھا تھا' ذرا سی بات پر گھبرا کر فائر کھول دینے والے دہشت گرد جہاز کے لیے بہت خطرناک ہوتے تھے۔

"جہاز بالکل کلین ہے۔ تمہارے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے۔" نوید نے اسے بتایا "ٹنکیاں فل ہیں اور میں پرواز کے لیے تیار ہوں۔ تم اپنے ساتھیوں سے کہو کہ پُرسکون ہو کر بیٹھ جائیں۔ مجھے بھی اتنی دیر میں کچھ کام نمٹانے ہیں۔"

"مثلاً؟"

"مجھے ریمپ ہٹوانا ہے اور پھر کلیرنس لینی ہے۔"

"ریمپ کیسے ہٹواؤ گے؟"

"ائرپورٹ کا عملہ آ کر ہٹائے گا۔"

بابر نے نفی میں سر ہلایا "یہ کام تو تم اپنے کریو سے لوگے' باہر کا کوئی آدمی جہاز کے قریب بھی نہیں آئے گا اور سُنو... میں فلائٹ سے پہلے ہی تم پر چند باتیں واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ میں نے اس جہاز کے کنٹرولز کے بارے میں سب کچھ جاننے میں بہت وقت صرف کیا ہے۔ تم کوئی گڑبڑ نہیں کر سکو گے مجھے بے خبر رکھ کر۔"

نوید نے کندھے جھٹک دیے۔ جہاز کے عملے کے لیے ریمپ کو پرے دھکیل دینا کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ تاہم وہ دہشت گرد کی بات پر غور کر رہا تھا۔ کسی بڑے جیٹ کے انسٹرومینٹس کے متعلق جاننے کے لیے ضروری تھا کہ دعوے دار نے پہلے بھی اس میں سفر کیا ہو۔ نوید کو یقین نہیں تھا کہ یہ بات ہے لیکن اس پر شک کرنا ٹھیک نہیں تھا کہ بابر واقعی اس جہاز کے بارے میں جانتا ہو گا۔ جو شخص دہشت گردی کی اتنی بڑی واردات کرکے کامیابی سے اس مرحلے تک آ پہنچا ہو' اس کے اہل ہونے میں شک نہیں کیا جا سکتا۔ نوید کا دہشت گردوں کے ساتھ کوئی چالبازی کرنے کا ارادہ نہیں تھا لیکن یہ خیال اس کے لیے تکلیف دہ تھا کہ وہ چاہے بھی تو چال بازی نہیں کر سکتا۔

لیکن نوید ایسا آدمی نہیں تھا کہ بابر جیسے کسی آدمی کو خود کو چیلنج کرنے کی آسانی سے اجازت دیتا۔ "جس دوران میرا اسٹاف ریمپ ہٹا رہا ہے' میں بھی تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں" اس نے کہا "میں جانتا ہوں کہ تم میرے جہاز پر دھماکا خیز مادہ لائے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم اسے چھوڑ کر فلائی کرنے پر رضامند نہیں ہو گے لیکن میری درخواست ہے کہ ٹیک آف کے بعد انہیں غیر مؤثر بنا دینا۔ کبھی کبھی جہاز عجیب کرتب دکھاتے ہیں اور موسم کی شعبدہ بازیاں الگ ہیں۔ جہاز میں کسی بھی وقت الیکٹریکل چارج پیدا ہو سکتا ہے اور ایسا ہوتے ہی سب کچھ ختم..."

"تمہاری فکر مندی اور ذمّے داری مجھے پسند آئی کیپٹن لیکن میرا جواب نفی میں ہے۔ یہ خطرہ مول لینا ضروری ہے۔" نوید خالی خالی نظروں سے خلا میں گھورتا رہا۔ "اور ہاں... تمہیں کنٹرول سے رابطہ کرکے میری آخری ہدایات ان تک پہنچانی ہیں" بابر نے کہا "ان سے کہو کہ تمام فلائٹس معطل کر دیں۔ مجھے کوئی جہاز اپنے تعاقب میں نظر نہیں آنا چاہیے۔ ورنہ اس جہاز کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ چلو' اب یہ ہدایات ان تک پہنچا دو۔"

نوید نے تعمیل کی۔ اس نے کنٹرول روم سے رابطہ کرکے یہ پیغام پہنچایا "ایک منٹ کیپٹن نوید۔" کنٹرول روم سے کہا گیا "ہدایات ہم نے نوٹ کر لی ہیں۔ اب اس کیس کے انچارج میجر نصیر آپ سے بات کریں گے۔" اگلے ہی لمحے ہیڈ فون پر میجر نصیر کی آواز اُبھری "کیپٹن... اگر اس وقت لائٹ چلی جائے اور میرے

جوان کارروائی کریں تو ہماری کامیابی کا امکان....."

"ایک فی لاکھ بھی نہیں ہے" کیپٹن نے کہا "میں آپ کو یہ مشورہ نہیں دے سکتا" اور اس کے ساتھ ہی اس نے رابطہ منقطع کردیا۔

ریمپ ہٹادیا گیا تھا!

"ایک بات اور کیپٹن" بابر نے کہا "تم ابتدا ہی سے پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرو گے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہمارا یہ پرندہ کسی بھی ریڈار پر دیکھا جائے۔"

کیپٹن نوید کو حیرت ہوئی۔ تاہم اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

○☆○

کمال نے سیٹ سے پیٹھ لگائی اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ خوش تھا کہ پیٹھ پر سے ایکسپلوزیوز کا بوجھ ہٹادیا گیا ہے۔ ہاتھ بھی کھول دیا گیا تھا۔ اتنی ہی دیر میں اس کی کلائی دُکھنے لگی تھی اور ہاتھ سوج گیا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ زیادہ ہی بے رحمی کا برتاؤ کیا گیا تھا۔ تاہم اس تکلیف سے ایک فائدہ ہوا تھا۔ اس کی توجہ اپنے کندھے کے زخم پر نہیں رہی تھی۔ صوفیہ دیکھ بھال کے باوجود کندھے کے زخم کو انفیکشن سے نہیں بچاسکی تھی۔ اسے اپنے بازو' کندھے اور وہاں سے پشت تک ایک دھڑکتی پھڑکتی آگ دہکتی محسوس ہورہی تھی۔ بایاں بازو بالکل بے کار ہوچکا تھا۔ بس وہ اب ایک دُکھتے ہوئے بہت بڑے پھوڑے کی طرح تھا جسے لٹکایا جاتا تو اذیت ہزار گنا بڑھ جاتی۔

لیکن بازو سے قطع نظر وہ جسمانی طور پر خود کو بہت بہتر محسوس کررہا تھا۔ چہرہ اور ناک اب نہیں دکھ رہے تھے۔ اب اسے یہ ڈر نہیں تھا کہ ہر بار جب بھی وہ کھڑا ہونے کی کوشش کرے گا' بے ہوش ہوجائے گا۔ دوسری طرف صوفیہ بھی اب بہتر لگ رہی تھی۔ اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

صوفیہ نے اپنی سیٹ پر پہلو بدلا "اب ہم کیا کریں گے؟" اس نے پوچھا۔

کمال نے فوراً جواب نہیں دیا۔ اپنی برہمی پر قابو پانے میں اسے کچھ دیر لگی۔ اس سوال نے اسے چڑادیا تھا۔ وہ تھکا ہوا اور مضمحل تھا پھر زخم میں بھی تکلیف تھی۔ صورتِ حال اتنی خراب تھی کہ اگر اس کا ہاتھ بیکار نہ ہوتا تب بھی وہ کچھ کر نہ پاتا۔ ایسے میں ایسا فعال جملہ..... اب ہم کیا کریں گے؟ وہ تو بس یہ اُمید ہی کرسکتا تھا کہ انہیں خود کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ بالآخر اس نے جواب دیا "جہاز سے اُتریں گے' ٹیکسی روکیں گے اور گھر چلیں گے۔"

"پلیز... مجھے یہ احساس دلاؤ' سب ٹھیک ہوجائے گا۔" صوفیہ نے گڑگڑا کر کہا۔

کمال کو اپنے فرسٹریشن سے احساس ہوگیا کہ اس وقت وہ کسی سے بات کرنے کے قابل نہیں ہے "سُنو صوفیہ۔ میں کوئی فلموں کا

ہیرو نہیں ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہم کیا کرسکتے ہیں اور کیا کرسکیں گے۔ وقت آنے پر میں کچھ نہ کچھ کروں گا لیکن ابھی میرے پیچھے نہ پڑو" وہ کوشش کے باوجود اپنے لہجے کو تلخی سے پاک نہ کرسکا۔ اسے گزرے ہوئے دو دن یاد آگئے۔ یاد آگیا کہ وہ کتنی بھیانک صورتِ حال سے دوچار ہے۔ اب وہ دہشت کا مطلب خوب سمجھتا تھا۔ انسانوں کے جیتے جاگتے جسموں میں خوف کے کیڑے کس طرح سرسراتے ہیں، روح کی کس کس طرح تذلیل کی جاسکتی ہے، اس نے جان لیا تھا۔ وہ جنگ بھی لڑچکا تھا اور ہتھیار ڈالنے کی ذلت سے بھی واقف تھا۔ اس نے جنگ میں انسانوں کو خود بھی ختم کیا تھا لیکن وہ زمانۂ جنگ تھا۔ وہ ۷۱ء کی بات تھی۔ فوج سے ریٹائرمنٹ لینے کے بعد اس نے عہد کیا تھا کہ اب کبھی خون نہیں بہائے گا۔ خواہ حالات کچھ بھی ہوں۔ اس عہد کی خاطر اس نے اپنے ماں باپ اور معصوم بہن کے قاتلوں کو بھی معاف کردیا تھا۔ اس نے ذہانت اور علم کو اپنا ہتھیار بنالیا تھا۔ وہ اپنی قوم کے بچوں کو اسی ہتھیار سے مسلح کررہا تھا۔ تو کیا اب.... اب وہ اپنا عہد توڑ سکے گا۔ اپنے مظلوم ماں، باپ اور بہن کی روحوں کو شرمندہ کرے گا۔

اس نے صوفیہ کی طرف سے منہ پھیرا اور سونے کی کوشش کی لیکن اس سے سویا نہیں گیا۔

○☆○

اسپتال میں جلیس ٹہل رہا تھا۔ ڈاکٹروں کے ساتھ اس کا چڑچڑاپن بڑھتا جارہا تھا۔ اس نے ڈاکٹروں کو بتایا تھا کہ یہ کئی انسانی جانوں کا مسئلہ ہے لیکن ڈاکٹروں نے اسے لڑکی سے ملاقات کی اجازت نہیں دی تھی۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ لڑکی ہوش میں ہی نہیں ہے.... نہ اس کی بات سمجھ سکے گی، نہ بول سکے گی تو ملاقات کا فائدہ؟

پچھلے ایک گھنٹے سے ڈاکٹر لڑکی کے پاس تھے۔ جلیس پریشان تھا کہ وقت نکلا جارہا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ کسی بھی وقت دہشت گردوں کا جہاز ٹیک آف کرجائے گا۔ اس نے پے در پے چار سگریٹیں پھونک ڈالیں۔ ہر کش اس کے سینے کے درد میں اضافہ کررہا تھا۔ گزشتہ دو روز سے وہ جس صبر و تحمل کا مظاہرہ کررہا تھا، وہ اب جواب دے چکا تھا۔ یہ خیال کہ لڑکی اسے معلومات فراہم کیے بغیر مرسکتی ہے اور یوں مجرم صاف بچ نکلیں گے، اس کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔

بالآخر دروازہ کھلا اور ایک ڈاکٹر باہر آیا۔ جلیس کو دیکھ کر اس کا منہ بن گیا "میں اس لڑکی کی اہمیت کو خوب سمجھتا ہوں جناب" ڈاکٹر نے کہا "لیکن آپ یہ بات نہیں سمجھ پارہے ہیں کہ صرف ہماری اور آپ کی خواہش سے لڑکی کی حالت بہتر نہیں ہوسکتی۔ کیس ہمارے ہاتھ سے نکلا جارہا ہے۔ اگر اس سے ملنا اتنا ہی اہم ہے تو آپ چند منٹ کے لیے اس سے مل سکتے ہیں لیکن زیادہ دیر نہ رُکیے گا۔ ہم آپریشن کی تیاری کررہے ہیں، اوکے؟"

جلیس نے سگریٹ نیچے گرا کر جوتے سے مسل دی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھے بغیر پوچھا۔ "اس کے بچنے کا امکان کتنا ہے؟"

"نہ ہونے کے برابر۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

پھر جلیس نے خود ہی دیکھ لیا کہ لڑکی کی حالت کتنی خراب ہے۔ لڑکی کی جلد اس قدر پیلی ہوگئی تھی کہ اس سے سبزی جھلکنے لگی تھی۔ ایسی رنگت اس نے سیکڑوں بار دیکھی تھی۔ صرف لاشوں میں۔ اس نے اپنی بڑھتی ہوئی تشویش سے لڑتے ہوئے لڑکی کو پُرسکون لہجے میں مخاطب کرنے کی کوشش کی۔ "میں سپرنٹنڈنٹ آف پولیس ہوں۔ میرا نام جلیس احمد ہے۔ سن رہی ہو تم؟ مجھے تم سے کچھ ضروری سوالات کرنے ہیں۔"

لڑکی نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ اس کے ہونٹ خشکی سے تڑخ رہے تھے۔ آنکھوں میں دُھندلاہٹ تھی۔

"وہ لوگ کہاں جائیں گے؟" جلیس نے پوچھا۔

ایسا لگا کہ لڑکی نے مسکرانے کی کوشش کی ہے پھر وہ بولی لیکن آواز اتنی دھیمی تھی کہ جلیس کو سننے کے لیے اس پر جھکنا پڑا۔ "تم تصور بھی نہیں کرسکتے کہ وہ کہاں جائیں گے۔"

"کہاں؟"

"یہ میں نہیں بتاسکتی۔" لڑکی نے ٹوٹتی آواز میں کہا۔

"سنو.... ہمیں یرغمالیوں کو بچانے کی کوشش کرنی ہے۔ معصوم لوگ خطرے میں ہیں۔"

وہ مسکرائی۔ "اب انہیں مردہ ہی سمجھو۔ معصوم لوگ ہی مرتے ہیں۔ بعض کئی کئی بار۔ جیسے میں اب تک کئی بار مرچکی ہوں۔" وہ رکی پھر بولی۔ "بابرا نہیں نہیں چھوڑے گا۔ وہ شیطان ہے۔"

"اسی لیے تو کہتا ہوں، ہمارا ساتھ دو۔ ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"میں نہیں کرسکتی۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"کیوں نہیں؟"

اب لڑکی سے بولا نہیں جارہا تھا۔ لفظ اس کے ہونٹوں پر ٹوٹ رہے تھے۔ "تم.... تم.... نہیں.... سمجھ.... سکو.... گے.... میرے.... پاس.... ان.... کے.... سوا.... کچھ.... نہیں.... بچا ہے۔"

جلیس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ وہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکا تھا۔ اتنی پیاری لڑکی.... اور اس کا ان ننگِ انسانیت وحشیوں کے سوا دنیا میں کوئی نہیں! اس کی شکست خوردگی اس لمحے حد سے گزر گئی تھی۔ "تم اپنا نام تو بتادو۔" اس نے کہا۔

"سب سے.... پہلے.... میرا نام ہی تو مرا.... تھا۔" وہ بمشکل بولی۔ "ایک.... بات بتائیں.... گے؟"

"ہاں کیوں نہیں؟" جلیس نے گہری سانس لی۔

"کل بھی سورج.... غروب.... ہوگا نا؟"

"ہاں۔"

"مجھے.... بہت.... اچھا...."

اسی وقت ڈاکٹر اندر آگیا۔ "سوری آفیسر! اس سے زیادہ وقت نہیں مل سکتا۔ آپ کو.... ویسے بھی آپ کی کال ہے۔"

جلیس باہر نکل آیا۔ استقبالیہ کی طرف بڑھتے ہوئے وہ دعا کر رہا تھا کہ کاش اسے لڑکی سے بات کرنے کا ایک موقع اور مل جائے۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ "جلیس اسپیکنگ۔"

"میجر نصیر بول رہا ہوں۔ کچھ معلومات حاصل ہوئیں؟"

"نہیں۔ اس وقت وہ آپریشن تھیٹر لے جائی جارہی ہے۔"

"برا ہوا۔ جہاز نے ابھی ٹیک آف کیا ہے۔"

درد جلیس کے سینے سے بائیں کندھے تک دوڑ گیا۔ ایک لمحے کو ایسا لگا' جیسے کسی نے اس کے دل کو مٹھی میں پوری قوت سے بھینچ لیا ہو۔ وہ جھکا اور اس نے گہری سانسیں لے کر درد سے لڑنے کی کوشش کی پھر اس نے سیدھا ہوتے ہوئے کہا۔ "میں آرہا ہوں۔" ریسیور رکھتے ہوئے اس نے سوچا کہ صبح وہ پہلا کام یہ کرے گا کہ کسی ہارٹ اسپیشلسٹ سے رجوع کرے گا۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ لڑکی کو آپریشن تھیٹر لے جایا جارہا تھا۔

○☆○

کمال جہاز کے ٹیک آف کا انتظار کرتے ہوئے عجیب کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اس کا ذہن خیالات کے بھنور میں کسی پہیے کی طرح تیز رفتاری سے گھوم رہا تھا۔ جب بھی وہ اسے روکنے کی کوشش کرتا' اسے دور کی کسی یاد کی ایک جھلک دکھائی دیتی اور گردش پھر شروع ہوجاتی۔ زندگی کیا ہے؟ اس سوال کے نپے تلے جوابات تھے۔ انتظار کا ایک پیہم' پریشان کن احساس' کسی مبہم وعدے کی وجہ سے حال کو نظرانداز کرنے کی حماقت۔ ایک ایسی مسلسل بوریت جو خلافِ توقع پیش آنے والے واقعات سے کبھی کبھی ٹوٹتی رہتی ہے۔ جو کبھی کبھی دلچسپ بھی ہوجاتی ہے اور اداسی! اور زندگی کا نہ ہونا؟ ہر مایوسی' ہر تباہی' پریشانی.... سب کچھ موت کے مقابلے میں بہتر ہے.... اور موت؟ وہ ہر چیز کی نفی ہے۔ بشمول زندگی۔ جو بے شمار گزرے ہوئے کل زمین تلے دفن کردیتی ہے۔

وہ جانتا تھا کہ موت کیا ہوتی ہے.... کیسی ہوتی ہے.... وہ اس کا تصور کرتا رہا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کا جسم پسینے میں نہا رہا ہے۔ خوف کا ذائقہ اسے اپنی زبان پر محسوس ہورہا تھا۔

جہاز کے ٹیک آف کرنے کے جھٹکے نے اسے چونکا دیا۔ اس نے کھڑکی سے دیکھا۔ شہر کی روشنیاں دور اور چھوٹی ہوتی جارہی تھیں۔ فضائی سفر اسے ہمیشہ اُداس کردیتا تھا۔ عام طور پر لوگوں کو سنسنی یا خوف کا احساس ہوتا ہے لیکن اسے لگتا تھا کہ وہ کوئی بہت قیمتی چیز پیچھے چھوڑ آیا ہے' جو اب اسے کبھی نہیں ملے گی۔ شاید وقت۔ وہ سوچتا تھا کہ زندگی اس کی ناموجودگی کے باوجود اپنے انداز میں بے پروائی سے جاری رہے گی۔

لیکن اس پرواز میں احساسِ زیاں بے حد شدید تھا۔ کیونکہ زندگی کی ضمانت تو کجا' کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ واپسی کا امکان نہیں تھا۔ وہ زندگی سے دور جارہا تھا اور زندگی کو جاری رہنا تھا۔ اسکول میں اس کی جگہ کوئی اور ٹیچر رکھ لیا جائے گا۔ جمیل الرحمان اس سے اسکول کی ملازمت جاری رکھنے پر کس قدر مصر تھے مگر اب انہیں جلد از جلد متبادل ٹیچر کے حصول کی فکر ہوگی۔ ابتدا میں طلبا اسے مس کریں گے مگر جلد ہی اسکول کی چھٹیاں ہوں گی۔ چھٹیاں گزار کر واپس آئیں گے تو وہ اسے بھول چکے ہوں گے۔ وہ متبادل ٹیچر کو قبول کرلیں گے۔

بابر ٹہلتا ہوا آیا اور اس نے شہلا اور نذیر سے سرگوشی میں کچھ کہا پھر وہ کیبن میں چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی نذیر کمال کے پیچھے والی سیٹ پر آبیٹھا اور شہلا نے دونوں لڑکوں کے پیچھے والی سیٹ سنبھال لی۔ نذیر نے کہا "ابھی روشنیاں گل ہونے والی ہیں۔ تم میں سے کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔"

کیبن میں بابر نے پائلٹ اور کوپائلٹ کے درمیان پوزیشن لے لی۔ مشکور نیوی گیٹر کے سر پر کھڑا ہوگیا۔

"تمہارا رخ کابل ہی کی طرف ہے نا؟" بابر نے نوید سے پوچھا۔

"خود دیکھ لو۔" کیپٹن نوید نے انسٹرومنٹس کی طرف اشارہ کیا "تم تو اس جہاز کے بارے میں سب کچھ جانتے ہو۔"

"بہت اسمارٹ بن رہے ہو کیپٹن۔ ابھی ہم پاراچنار سے پیچھے ہی ہیں نا؟"

"میں نے کہا نا' خود دیکھ لو۔ میرے کہنے پر تو تمہیں یقین نہیں آئے گا۔"

بابر نے اس کی طرف کاغذ کا ایک ٹکڑا بڑھایا۔ "یہ ہیں تمہاری نئی ہیڈنگز۔"

نوید نے کاغذ کا جائزہ لیا۔ "جنوب مشرق کی سمت؟"

"ہاں۔"

"مجھے بتادو کہ ہم کہاں جارہے ہیں۔ تاکہ میں اس کے لیے تیار رہوں۔"

بابر نے ہاتھ بڑھا کر ریڈیو آف کردیا۔ "تم فکر نہ کرو۔ جہاز کے کسی چیز سے ٹکرانے کا کوئی امکان نہیں اور اب تم جہاز کی لائٹس بھی آف کردو۔"

"یہ خطرناک ہوگا۔" کیپٹن نے احتجاج کیا۔

"جیسا میں کہتا ہوں' ویسا ہی کرنا ہے تمہیں۔"

نوید نے تعمیل کی پھر بولا "سنو.... تم جہاز سے چھلانگ لگانے کا ارادہ تو نہیں رکھتے؟" اس کے لہجے میں تجسس تھا۔

"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔"

"گڈ۔ اگر تم ملک میں کہیں بھی جہاز اُتارو گے تو پولیس تمہاری منتظر ہوگی۔"

"ٹھیک کہتے ہو لیکن تم نے ایک امکان پر غور ہی نہیں کیا ہے۔" بابر نے سرد لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"تم نے یہ فرض کرلیا ہے کہ ہم کسی ایرپورٹ پر اُتریں گے۔"

کیپٹن نوید دہل کر رہ گیا۔ "سنو... اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں ایرپورٹ کے علاوہ کہیں یہ جہاز اُتاروں گا تو تم غلطی پر ہو۔" اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

بابر نے پستول نکالا اور اس کی گدی سے لگا دیا۔ "میرے خیال میں تمہارا کو پائلٹ زیادہ تعاون کرے گا۔" وہ بولا۔ "اور اس صورت میں مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ریوالور ہٹالو۔ تم نے مجھے تجسس میں مبتلا کر دیا ہے۔ میں تمہاری حماقت مِس نہیں کرنا چاہوں گا۔" نوید نے جلدی سے کہا۔

"گڈ۔ اب میری ہدایات سُنو۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی اس نئی منزل کے لیے تم جہاز کو ہموار انداز میں گھماؤ۔ اب تمہیں ریڈیو کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہاری آنکھوں کا کام کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اندر سے بھی اور باہر سے بھی لائٹس آف کر دی جائیں۔ گڈ.... تم نے جہاز کو صحیح راہ پر ڈال دیا ہے۔ یہ بہت عمدہ ٹرن تھا۔ اپنی رفتار دو سو ناٹس رکھو۔ اب ۲۵ منٹ تک اس ہیڈنگ کی طرف چلتے رہو۔ بعد کی بات میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ اس دوران اپنے کو پائلٹ سے کہو کہ چوکنا رہے۔ جہاز کو کسی چیز سے ٹکرانا نہیں چاہیے۔" اس نے کو پائلٹ اور نیوی گیٹر کے سروں سے ہیڈ فون اُتار لیے۔ اس نے چیک کیا کہ مائیکرو فون بھی ہٹا دیے گئے ہیں یا نہیں۔ "اب ہماری باہر کی دنیا سے بات نہیں ہوگی۔" اس نے مزید کہا۔ "تم میں سے کسی نے سیٹ سے اٹھنے کی کوشش کی تو مشکور تمہیں ختم کردے گا۔" وہ لائٹس بجھنے کا انتظار کرتا رہا پھر کیبن سے نکل آیا۔

○☆○

کمال کے لیے وہ ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ اسے جیٹ انجنوں کی دہاڑ سُنائی دے رہی تھی اور وہ خود کو آگے کی طرف گرتا محسوس کررہا تھا لیکن آنکھیں جیسے بینائی سے محروم ہوگئی تھیں۔ اسے کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ تاریکی جہاز کے اندر کس مقام پر ختم ہو رہی ہے اور باہر کی بیکراں تاریکی کہاں سے شروع ہو رہی ہے۔ اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ کس سیٹ پر بیٹھا ہے، درمیانی راستہ کتنا چوڑا ہے اور فرنٹ سے بیک تک نشستوں کی کتنی قطاریں ہیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نذیر نے خواہ مخواہ ہی دھمکی دی ہے کہ کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ وہ سیٹ سے کیا اُٹھتا۔ جب کچھ سجھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا بھی ہوتا تو اسے پتا نہیں چلتا کہ وہ کہاں ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ صوفیہ نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ اچھل پڑا۔ صوفیہ نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ کی لرزش سے اس کی اعصابی کشیدگی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اس خاموشی میں صوفیہ کے دل کی دھڑکن اسے اس کے ہاتھوں میں محسوس ہو رہی تھی۔ وہ چند منٹ اس کے قرب کی حدت سے محظوظ ہوتا رہا پھر تحفظ کی وہ فضا اچانک ہی درہم برہم ہوگئی۔ اس کے جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔ اسے اپنے قریب کسی چیز کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ وہ کیا تھی، یہ وہ نہیں سمجھ سکتا تھا۔

پھر ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ "ہیلو کمال رشید کیا ہو رہا ہے؟" آواز اس کے کان سے بہت قریب تھی۔ "خاصی دیر ہوگئی۔ تم سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اس لیے کہ میں بہت زیادہ مصروف تھا۔" لہجے میں تمسخر تھا۔ "مگر میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے اب بھی تم سے محبت ہے۔ تمہاری بہت فکر ہے مجھے۔"

کمال نے خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کی۔ "تمہاری حس مزاح ناقابلِ برداشت ہے بابر۔"

"مجھے خوشی ہے کہ میں تمہیں مزاحیہ کردار لگتا ہوں۔" بابر نے کہا "مجھے اُمید ہے کہ تم ہنستے ہوئے مرو گے۔"

"اور میں تمہاری دھمکیوں سے تنگ آچکا ہوں۔"

"اوہ.... میرا خیال ہے، یہ بات اب واضح ہوجانی چاہیے۔ میں دھمکی نہیں دے رہا ہوں، وعدہ کررہا ہوں تم سے۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اب ایک گھنٹا گزرنے سے پہلے تم مرجاؤ گے۔"

کمال کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ "بابر.... میرا مشورہ ہے کہ یہ کام صفائی سے کرنا...... یقینی طور پر"

"کمال رشید.... کیا یہ دھمکی ہے؟"

"نہیں بابر۔ یہ بھی ایک وعدہ ہے۔ اگر مجھے موقع ملا تو میں تمہیں ضرور ختم کروں گا۔ سُنا گندی نالی کے کیڑے۔" کمال نے کہا اور اب وہ بابر کے ردِعمل کا منتظر تھا لیکن وہاں خاموشی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ شاید بابر اس اندھیرے میں کہیں کھسک گیا تھا۔ تاکہ وہ اس کے الفاظ پر غور کرتا اور پریشان ہوتا رہے۔ اپنی موت کا تصور کرے۔ سوچے کہ وہ کس انداز میں قتل کیا جائے گا اور تصور میں خود کو مردہ دیکھے۔

ذہنی طور پر کمال جانتا تھا کہ جہاز کے لینڈ کرتے ہی اس کی زندگی کا خاتمہ ہوجائے گا۔ وہ تصور میں بابر کو دیکھ سکتا تھا کہ وہ اس کے سر سے گن لگا کر ٹریگر دبا رہا ہے۔ اس کے باوجود موت اس کے تصور میں نہیں آئی تھی۔ وہ تصور میں اپنے سر کو اُڑتے.... ٹکڑوں میں تقسیم ہوتے دیکھتا۔ خود کو خون اور بھیجے میں نہایا ہوا دیکھتا۔ اس کے باوجود زندگی سے اس کا ناتا نہ ٹوٹتا۔ وہ دنیا سے رخصت نہ

ہوتا۔ اس لیے کہ اس نے دنیا میں ابھی کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ اسے ابھی بہت کچھ کرنا تھا۔ وہ سوچتا' ڈراما ختم ہونے.... مکمل ہونے سے پہلے صرف چھوٹے موٹے کردار ہی مرتے ہیں۔ ہیرو پر کچھ بھی گزرے' لیکن وہ اپنے عمل سے ڈرامے کو اس کے منطقی انجام تک پہنچا کر دم لیتا ہے۔ یہ اس کی ذمّے داری ہوتی ہے۔ اس سے پہلے ڈائریکٹر اسے مرنے نہیں دیتا۔ وہ بدی کو ختم کردے یا بدی کے ہاتھوں ختم ہوجائے لیکن اس کے اور بدی کے درمیان فائنل ضرور ہوتا ہے۔ ہیرو بے بسی کی موت نہیں مر سکتا۔ ہاتھ پاؤں ہلائے' مقابلہ کیے بغیر وہ بدی کے ہاتھوں ختم نہیں ہوسکتا۔ یہ نیکی کی.... ہیروشپ کی توہین ہے۔

اس نے خود کو کبھی ہیرو نہیں سمجھا تھا لیکن بزدل بھی کبھی نہیں سمجھا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں چھوڑ کر پوری سپردگی کے ساتھ اس طرح کی موت کو قبول کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا' جہاں اس کی موت بدی کی فتح کی علامت ہو۔ بابر شیطان تھا' اور وہ اس سے صرف اتنا مطالبہ کررہا تھا کہ وہ اس کے ایک اشارے پر مرجائے لیکن یہ تو ٹھیک نہیں۔ ایسا ہونے سے روکنے کے لیے اسے کچھ کرنا ہوگا۔ کوئی جوابی منصوبہ بنانا اور بڑے محتاط انداز میں اس پر عمل کرنا ہوگا لیکن کیسا منصوبہ؟ جبکہ وہ وسائل سے پوری طرح محروم ہے۔ وہ کیا کرسکتا ہے؟ وہ سوچتا رہا.....

○☆○

کنٹرول ٹاور میں بہت شور ہو رہا تھا۔ باہر نکل کر جلیس نے سکون کی سانس لی۔ میجر نصیر اس کے ساتھ تھا۔ دونوں کافی پینے کے لیے نکلے تھے۔ میجر نصیر کی شخصیت نے اسے اس بار بہت متاثر کیا تھا۔ وہ اپنے کام سے بہت مخلص تھا۔ اوپر کے احکامات اسے بھی برہم کرتے تھے۔ وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ مجرموں کو کسی قیمت پر بھی کامیاب نہ ہونے دے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے مجرموں کو من مانی کی اجازت دینا اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ مجرموں کے کامیابی سے بچ کر نکل جانے کا تصور اس کے لیے سوہانِ روح تھا لیکن وہ حقیقت پسند بھی تھا۔ صورتِ حال مخالف ہو تو وہ پیچھے ہٹنے کی اہمیت بھی سمجھتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اربابِ اختیار کا حکم ماننے میں ہی بہتری ہے۔ بے سبب خود پر کیوں الزام لیا جائے۔ ذمے داری فیصلہ کرنے والوں پر ہی کیوں نہ چھوڑی جائے۔

جلیس سوچ رہا تھا کہ کاش وہ بھی اس جیسا ہوتا۔ تو اس وقت اتنا بے سکون نہ ہوتا۔ سینے میں درد کا پیوست نیزہ لیے یوں نہ پھر رہا ہوتا۔ یوں مطعون نہ ہوتا لیکن یہ کہاں ممکن تھا۔ پولیس آفیسر ہونے کا اپنا ایک پریشر ہے۔ پولیس کے محکمے کو اتنا خراب سمجھا جاتا ہے.... اتنا غیر مستعد' غیر ذمّے دار کہ اچھے آدمی... اچھے پولیس آفیسر پر اس تاثر کو زائل کرنے کا اضافی دباؤ بھی ہوتا ہے۔

ائرپورٹ کے ریسٹورنٹ میں بیٹھے وہ دونوں کافی کے گھونٹ لیتے ہوئے اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔

میجر نصیر نے سر اُٹھا کر اسے دیکھا۔ "سنو... کچھ کھایا بھی ہے تم نے؟ سینڈوچ منگوالوں؟"

جلیس نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں میں کچھ نہیں کھا سکتا۔ میرا تو ویسے ہی جی متلا رہا ہے۔"

میجر نے جیب سے ایک ٹیبلٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔ "یہ پانی سے لے لو۔ ویسے سب سے زیادہ تمھیں نیند کی ضرورت ہے۔"

"ہاں' نیند کی اور ڈھنگ سے کھانا کھانے کی۔" جلیس نے ٹیبلٹ حلق سے اُتارنے کے بعد کہا۔ "اور شاید ڈاکٹر کی۔ میرے سینے میں شدید درد ہے۔ بابر نے مجھ پر گولیاں چلائی تھیں۔ میں نے بچنے کے لیے جو چھلانگ لگائی تو سینے کی کوئی مسل کھنچ گئی ہے۔"

"درد کس طرف ہے۔"

"بائیں جانب۔"

"یہ تشویش ناک بات ہے۔ خاص طور پر متلی کے ساتھ۔ تمھیں فوراً ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے۔"

جلیس نے اس کی بات نہیں سُنی۔ وہ بابر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ شخص کہاں جائے گا۔ کابل؟ یا کہیں اور۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ خاص طور پر دہشت گردوں کے لیے۔ وہ کہیں بھی جاسکتا ہے۔ تمام ممکنہ ائرپورٹس کو خبردار کردیا گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جو کچھ بھی ہوگا' اس کی ذمّے داری ہوگی۔ اسے مری میں ہی ان پر قابو پالینا چاہیے تھا۔ وہ اچھا پولیس آفیسر ثابت نہیں ہوا۔ اسے باہر کا خیال ابتدا ہی میں کرنا چاہیے تھا۔ یہ غیر منطقی نہیں تھا کہ مجرموں نے اپنے کسی ساتھی کو کسی ایسی بلڈنگ میں چھوڑا ہو' جہاں سے اسکول پر نظر رکھی جاسکے۔ یہ بات اس نے ابتدا میں ہی سوچ لی ہوتی اور لڑکی کو گرفتار کرلیا ہوتا تو اس کی کارروائی کبھی ناکام نہ ہوتی اور مجرم ناکام ہوچکے ہوتے۔ اگر وہ لڑکی....

لڑکی کا خیال آتے ہی اس کے سینے میں درد کی ایک نئی لہر اُٹھی۔ اس نے سوچا' اسے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہیں رکنا چاہیے تھا۔ لڑکی سے معلومات حاصل ہوجاتیں تو مجرموں کی منزل کے متعلق معلوم ہوجاتا پھر انھیں بے خبری میں چھاپا جاسکتا تھا۔

جلیس میجر سے لڑکی کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا تھا لیکن اسے ڈر لگ رہا تھا۔ اس کی باتوں میں کہیں اس کا احساسِ جرم نہ جھلک جائے۔ وہ یہ اعتراف کسی اور کے سامنے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے لڑکی سے معلومات حاصل کرنا اس کے لیے اہم ہوگیا تھا۔

اسی وقت ایک جوان میجر نصیر کے پاس چلا آیا۔ "سر.... آپ کنٹرول روم میں چلیں۔ گڑبڑ ہوگئی ہے۔"

میجر تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "ایکسکیوز می۔" اس نے کہا۔

میجر نصیر کو پہلے ہی ڈر تھا کہ یہ کام آسان ثابت نہیں ہوگا۔ بابر بہت خبیث اور ذہین مجرم تھا۔ اس نے مکمل تیاریوں کے ساتھ مکمل ترین منصوبہ بنایا تھا اور شاید وہ ان تمام ٹیکنیکس سے واقف

تھا' جو دنیا بھر میں دہشت گردوں سے نمٹنے کے لیے آزمائی جاتی ہیں۔ اس نے تنبیہہ کردی تھی کہ اس کے تعاقب میں کوئی طیارہ نہ آئے۔ میجر نے اس کا توڑ یہ کیا تھا کہ تعاقب کرنے والے ائرفورس کے جیٹ طیارے کو تاخیر سے پرواز کرنے کی ہدایت دی تھی۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ یہ اس کی غلطی تھی۔ اسے تعاقب کرنے والے طیارے کو پہلے ہی فضا میں پہنچا دینا چاہیے تھا۔

ریڈار اسکوپ پر ایک نظر ڈالتے ہی اسے احساس ہو گیا کہ اس کا خدشہ درست ہے۔

"انہوں نے سمت کب تبدیل کی؟" اس نے پوچھا۔

"ہمیں نہیں معلوم سر۔ وہ صرف دو منٹ ریڈار پر نظر آئے۔ ہم نے ہر جگہ رابطہ کرلیا ہے۔ وہ کہیں' کسی ریڈار پر نمودار نہیں ہوئے ہیں۔"

"پائلٹ سے تمہارا رابطہ نہیں ہے؟"

"میں نے بہت کوشش کی ہے سر لیکن انہوں نے ریڈیو بند کر دیا ہے شاید۔"

"اور جیٹ طیارے کی کیا رپورٹ ہے؟"

"وہ 737 تک پہنچ ہی نہیں سکا جناب۔"

میجر نصیر نیچے چلا آیا۔ وہ بہت پریشان تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ مجرم ان کے ہاتھ سے نکل گئے ہیں۔ پیراشوٹ طلب کرنے کو اس نے بلف سمجھا تھا۔ اس کے خیال میں بوئنگ 737 ایسا جہاز نہیں تھا' جس میں سے آسانی سے چھلانگ لگائی جاسکے اور اس کا خیال تھا کہ بابر اتنا پاگل نہیں کہ ایسی کوئی کوشش کرے گا۔ پیراشوٹ صرف انہیں دھوکا دینے کے لیے تھے لیکن اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ وہ لوگ کہیں بھی چھلانگ لگا دیں گے اور وہ ان کے متعلق جانتے کچھ بھی نہیں تھے۔ صرف نام انہیں معلوم تھے اور ناموں سے مجرموں کی شناخت ممکن نہیں تھی پھر بھی اس سلسلے میں تمام بڑے شہروں کی پولیس سے رابطہ کرلیا گیا تھا۔

میجر نصیر کو اس وقت خود پر زبردست غصہ آرہا تھا۔

○☆○

بابر نے کیپٹن نوید کے پیچھے کھڑے ہو کر جھکتے ہوئے انسٹرومنٹس کو چیک کیا۔ مطمئن ہونے کے بعد اس نے کہا۔ "تم شاندار کام کررہے ہو کیپٹن۔ اب تم جہاز کو گھماتے ہوئے بتدریج نیچے کی طرف لاؤ گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب تم دو ہزار فٹ کی بلندی پر ڈیڑھ سو ناٹ کی رفتار سے چلو۔" یہ کہہ کر اس نے کیپٹن کی طرف ایک اور کاغذ بڑھا دیا۔

کیپٹن نوید انسٹرومنٹس کی ہلکی روشنی میں کاغذ کو گھورتا رہا پھر بولا "دوبارہ رخ تبدیل کریں.....؟"

"ہاں۔"

"لیکن جہاز کو اتنی کم بلندی پر اُڑانا اور اتنی کم رفتار پر..... یہ مناسب نہیں۔ خاص طور پر اس لیے کہ مجھے نہیں معلوم' میں کہاں ہوں اور باہر کیا کچھ ہے۔"

"میری ہدایات پر عمل کرتے رہو تو کسی چیز سے نہیں ٹکراؤ گے۔" بابر نے کہا "تمہیں مجھ پر اعتبار اور انحصار کرنا ہوگا۔"

"تم پر اعتبار! تم پر انحصار! میں تمہیں اس قابل نہیں سمجھتا۔" کیپٹن نوید کا پیمانۂ صبر لبریز ہونے لگا۔ اس شخص کے ساتھ تحمل ناممکن تھا' وہ تو اس کی تربیت کو بھی تباہ کیے دے رہا تھا۔

"میں اب تمہیں پسند کرنے لگا ہوں کیپٹن۔" بابر نے بڑے خلوص سے کہا۔

"لیکن یہ پسندیدگی دو طرفہ نہیں ہے۔"

"تم اچھے بچوں کی طرح کہنا مانتے رہو تو ایسی چھوٹی موٹی باتوں کو میں کوئی اہمیت نہیں دوں گا۔"

نوید نے جہاز کا رخ موڑا اور بلندی کم کرتے ہوئے نئی ہیڈنگ کی طرف بڑھنے لگا۔ رفتار کم کرنے کے بعد اس نے پوچھا۔ "کیا واقعی تم چھلانگ لگانے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"تمہارے لہجے سے لگتا ہے کہ تمہارے خیال میں ہم ایسا نہیں کرسکتے!" بابر کے لہجے میں کھلنڈرا پن تھا۔

نوید سے اس کا لہجہ برداشت نہ ہوسکا۔ "کاش..... میں یہ منظر دیکھ سکوں۔ بعد کا حال تو مجھے معلوم ہے۔ تمہارے وجود کو زمین سے سمیٹنے میں ہفتوں لگیں گے۔"

"یقین سے کہہ رہے ہو یہ بات؟"

"میں جانتا ہوں کہ اس جہاز کی رفتار اتنی کم نہیں کرسکتا کہ تم محفوظ طریقے سے چھلانگ لگا سکو۔ اس کام کے لیے جہاز کی رفتار اتنی کم ہونی چاہیے کہ وہ جہاز کے فضا میں لٹک جانے کے برابر ہو اور یہ ناممکن ہے۔"

"یہ حساب میں بھی لگا چکا ہوں۔ اس لیے میرا جمپ لگانے کا کوئی ارادہ نہیں۔" بابر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

نوید نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ "تو پھر تمہارے ارادے کیا ہیں؟"

"لینڈنگ۔"

"لینڈنگ! یہاں؟"

"ہاں..... بالکل یہیں۔ اسی جگہ۔"

"اب مجھے یقین ہو گیا کہ تم پاگل ہو۔"

○☆○

میجر نصیر کنٹرول ٹاور میں ٹہل رہا تھا۔ وہ پریشان تھا۔ آدھا گھنٹا ہوچکا تھا۔ دہشت گردوں کے جہاز کے متعلق کوئی اطلاع نہیں مل رہی تھی۔ جہاز کو کہیں کسی ریڈار پر نہیں دیکھا گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ موسم تھا۔ آسمان پر بادل بہت زیادہ تھے اور شاید جہاز کو بہت

بلندی پر اُڑایا جا رہا تھا۔ آخری پوزیشن کے مطابق جہاز کا رخ کابل کی طرف تھا مگر اس کے بعد سے اب تک کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

اب میجر نصیر کو یہ ڈر تھا کہ کہیں جہاز کسی حادثے کا شکار نہ ہو گیا ہو۔ اس وقت فضائیہ کے کئی جہاز گمشدہ جہاز کی تلاش میں اردگرد کے علاقے کو کھنگال رہے تھے۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ بابر نے جہاز کسی صحرا میں اُتروالیا ہو۔ اس صورت میں صبح ہونے سے پہلے اس کا پتا چلنا ناممکن تھا۔ اس صورت میں بابر کو ان پر... کم ازکم آٹھ گھنٹے کی سبقت حاصل ہو جاتی اور آٹھ گھنٹے میں تو پورا گروپ یوں غائب ہو تا کہ سراغ بھی نہ ملتا۔

وہ ٹہلتے ٹہلتے جلیس کے پاس رک گیا۔ ”اب مجھے پریشانی ہو رہی ہے۔“ اس نے کہا ”تم اسپتال سے چیک تو کرو۔ اس لڑکی کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔ اب ہمارے پاس وہی ایک کلیو رہ گیا ہے۔“

جلیس کا درد ویسے کا ویسا ہی تھا۔ وہ کسی مریض کی مانند تھا' جسے نیند آتی ہو لیکن پوری طرح نہ سو پاتا ہو۔ کچی نیند میں ہی معمولی سی آہٹ پر بھی جاگ جاتا ہو۔ اس وقت میجر نصیر کے لفظوں نے اور مجرموں کی ساتھی لڑکی کی یاد نے اسے پھر جگا دیا۔ ”میں ابھی فون کر کے پوچھتا ہوں۔“ اس نے کہا اور برابر والے کمرے کی طرف بڑھ گیا' جس میں فون تھا۔

میجر نصیر پھر مضطربانہ انداز میں ٹہلنے لگا۔ لڑکی واقعی اب بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ وہ بتا سکتی تھی کہ مجرموں کا منصوبہ کیا ہے۔ اگر وہ لینڈ کر چکے ہیں تو لڑکی سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں وہ تیزی سے جہاز تک پہنچنے کی کوشش کر سکتے تھے۔ وہ یرغمالیوں کو بچانے اور دہشت گردوں کو پکڑنے کی کوشش کر سکتے تھے۔

اس نے رُک کر ریڈیو کی طرف دیکھا۔ یہ ایک اور مصیبت تھی۔ وزیرِ داخلہ اب تک متعدد بار اسے مخاطب کر چکے تھے۔ ان کی پریشانی قومی بھی تھی اور ذاتی بھی لیکن ان کی کال ہر بار اس پر موجود دباؤ میں اضافہ کر دیتی تھی۔ وہ جہاز کے اوجھل ہو جانے کو اس کی غیر ذمے داری سمجھ رہے تھے۔ اگرچہ انہوں نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ انہیں بتا چکا تھا کہ ان کی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوئی ہے۔ دہشت گردوں نے منصوبہ بناتے ہوئے آخر تک تمام جزئیات کا خیال رکھا تھا اور پھر قسمت بھی ان کا ساتھ دے رہی تھی۔

وہ فون روم کی طرف بڑھا تاکہ جلیس سے صورتِ حال معلوم کرے لیکن کمرے میں جو کچھ نظر آیا' وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ جلیس دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ نصیر کو دیکھ کر وہ لڑکھڑاتا ہوا اس کی طرف بڑھا مگر درمیان میں ہی اس کے جسم کو تشنج کا جھٹکا لگا اور وہ

دُہرا ہوگیا۔ نصیر نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالا۔ جلیس نے سر اٹھایا۔ اس کا چہرہ ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ اسی لمحے اسے دوسرا جھٹکا لگا اور وہ نصیر کے ہاتھوں سے چھوٹ کر فرش پر گرتا چلا گیا۔ نصیر اس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

لفظ جلیس کے ہونٹوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہوئے۔

"وہ... آپریشن.... کے .... دوران.... مرگئی....." پھر وہ ایک طرف لڑھک گیا۔

میجر نصیر نے اسے سیدھا کیا' اس کے سینے پر ہاتھ رکھا' نبض ٹٹولی لیکن کہیں کچھ نہیں تھا۔ سانسوں کی ڈور ٹوٹ چکی تھی۔

میجر نصیر کئی لمحے ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ ایس پی جلیس احمد کی پوسٹ مارٹم رپورٹ یہی بتاتی کہ اس کی موت فطری ہے لیکن وہ جانتا تھا کہ بابر کے ہاتھوں مرنے والوں کی تعداد چھ ہوگئی ہے۔ جلیس اس دباؤ کے ہاتھوں ختم ہوا تھا' جو بابر کے بہیمانہ جرم کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا۔

میجر کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ "بابر!" وہ غرایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

○☆○

کیپٹن نوید نے جہاز کی نوز کے پار زمین کو محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن وہاں کچھ نہیں تھا۔ اس کے انسٹرومنٹس بھی اسے کچھ نہیں بتا رہے تھے۔ روشنی نہ ہونے سے اسے الجھن ہو رہی تھی۔ ونگ لائٹس کی کمی اسے شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ہوتی تو کم از کم اسے فلائنگ لیول کا اندازہ تو ہوتا۔ وہ بابر پر انحصار نہیں کرسکتا تھا۔ ممکن ہے' وہ کوئی جینئس ہو لیکن وہ ہواباز تو نہیں تھا۔ بلکہ وہ ایک خطرناک مجرم.... دہشت گرد تھا۔ ایسے لوگوں کے ذہن پر اور ذہن کی کارکردگی پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ ایسے مجرم بہرحال کسی نہ کسی حد تک نفسیاتی مریض ہوتے ہیں اور بابر تو اسے اچھا خاصا پاگل لگ رہا تھا۔ مشکور اسے ٹھیک ٹھاک لگا تھا لیکن بابر کو اس نے پہلی ہی نظر میں ناپسند کیا تھا۔

اور اب.... وہ ایک نامانوس جہاز خطرناک حد تک کم بلندی پر اُڑا رہا تھا اور اسے نہیں معلوم تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ اب اسے کہا جارہا تھا کہ اس مہیب اندھیرے میں جہاز لینڈ کرے اور وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ یہ نہ جانتا کہ جہاں اسے جہاز لینڈ کرنے کو کہا جارہا ہے' وہ کوئی ایسی جگہ ہے' جو جہاز اُتارنے کے لیے نہیں بنائی گئی ہے۔ کیونکہ یہ شخص بابر کتنا ہی چالاک سہی لیکن یہ تو ممکن نہیں کہ اس نے کسی صحرا میں لینڈنگ کے لیے کوئی پٹی بنادی ہو۔ یہ ممکن نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ احمق اس سے کسی پرانی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر جہاز اُتارنے کی فرمائش کرے گا۔ اس نے کوپائیلٹ سے کہا۔ "یہ بابر وہاں مظلوم لوگوں کو ذلیل اور خوف زدہ کرنے کے بجائے یہاں آکر ہمیں بتاتا کیوں نہیں کہ اب کیا کرنا ہے۔"

کوپائلٹ منیر نے کہا "مجھے جب بتایا گیا کہ اس فلائٹ کے پائلٹ آپ ہوں گے تو میں نے فوراً یہ ذمے داری قبول کرلی مگر اب میں سوچ رہا ہوں کہ نیچے کیا ہے' یہ نہ آپ جانتے ہیں نہ میں جانتا ہوں۔ اس جہاز کو اتارنے کے لیے تو کسی سپرمین کی ضرورت ہے۔"

"سپرمین کو اتنی فرصت کہاں۔"

"ایک بات بتائیں۔ آپ کو اندازہ ہے کہ اس وقت ہم کہاں ہیں۔"

نوید چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ "میرا خیال ہے بالائی پنجاب میں کہیں ہیں۔"

"یعنی ہمیں اترنے کے لیے کوئی انٹرنیشنل ائرپورٹ نہیں ملے گا۔"

"میری پریشانی اس سے کہیں سوا ہے۔"

دونوں آنکھیں پھاڑ کر اندھیرے میں کسی ممکنہ خطرے کو ٹٹولتے اور باتیں کرتے رہے۔ "ایک بات اور بتائیں کیپٹن۔" منیر نے کہا "اگر کسی ائرفیلڈ سے ہٹ کر کہیں جہاز لینڈ کرنا پڑا تو آپ کرسکیں گے؟"

نوید مسکرا دیا۔ "مجھ پر جو تم اعتماد کا اظہار کررہے تھے' وہ کیا ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ میں جہاز کو لینڈ کرسکوں گا لیکن پہلے ہم اس مقام تک پہنچیں تو۔ پھر اس کی فکر کریں گے۔ اگر زمین ناہموار ہوئی اور ایک آدھ وہیل ٹوٹ گیا تو بڑی خطرناک لینڈنگ ہوگی اور میرے بھائی' ٹنکیاں فل ہونے کی وجہ سے مسئلہ سنگین ہوجائے گا۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔"

"دعا کرو کہ وہ مردود بابر بھی اس سلسلے میں سوچ لے۔"

"کسی نے مجھے یاد کیا؟" وہ بابر کی آواز تھی۔ وہ اسی لمحے کیبن میں داخل ہوا تھا۔

"یہ جوتے تمہارے زبردست ہیں۔ ساؤنڈ پروف۔" نوید نے کہا۔ "انہیں پیٹنٹ کرالو۔"

"تم اچھے خاصے مسخرے ہو کیپٹن۔ جتنے زبان دراز ہو' اتنے ہی اچھے ہواباز بھی ہو تو بہتر ہے۔"

"ہواباز میں زیادہ اچھا ہوں۔"

"گڈ۔ اب آزمائش کا وقت بھی آپہنچا ہے۔ میری تجویز ہے کہ اب تم پہیے کھول دو اور جہاز کی رفتار کم سے کم کردو۔ رن وے بہت تنگ ہے۔"

"کیسا رن وے؟" نوید نے چڑچڑے پن سے پوچھا۔

"کھڑکی سے باہر دیکھو تو تمہیں اپنا رن وے نظر آجائے گا۔"

کیپٹن نوید نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ہلکی روشنی میں اسے دو متوازی سیاہ لکیریں سی نظر آئیں۔ پٹی واقعی بہت تنگ تھی اور مختصر بھی۔ اس پر جہاز اتارنا بہت دشوار کام تھا۔ "اس سے تو اچھا تھا کہ تم مجھ سے ماچس کی ڈبیا پر لینڈنگ کی فرمائش کرتے۔"

"یہ ماچس کی ڈبیا نہیں ہے کیپٹن لیکن تمہارے پاس غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

"اگر یہ ٹھوس رن وے نہیں ہے تو جہاز اسے کھود ڈالے گا اور دھنس جائے گا۔" نوید نے کہا۔ اس نے جہاز کے پہیے کھول دیے تھے اور اب رفتار کم کر رہا تھا۔

"مجھے داد دینی پڑے گی تمہیں۔" بابر نے مربیانہ انداز میں کہا "میں نے بہت سوچ سمجھ کر اس جگہ کا انتخاب کیا ہے۔ کتنا خوبصورت رن وے ہے۔ یہ جانتے بھی ہو' یہ کیا ہے؟"

"تم ہی بتادو۔" کیپٹن نوید نے بے زاری سے کہا۔

"یہ تمہارا چھ لین کا موٹر وے ہے جو اب سکڑ کر چار لین کا رہ گیا ہے۔" بابر نے انکشاف کیا۔ "اَن چھوا..... کنوارا موٹر وے' جو ابھی تک استعمال نہیں ہوا ہے۔ پچھلی بار جب میں یہاں آیا تھا' اس کے مقابلے میں اب یہ سو فٹ بڑھ گیا ہے۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ہمارے ہاں سڑکیں کتنی سست رفتاری سے بنتی ہیں۔ اب تو غیر ملکی مستعد کمپنیوں کو بھی سست رفتاری پر مجبور کردیا گیا ہے۔"

"تم پاگل ہوگئے ہو۔" نوید کا دماغ گھوم گیا۔

"غور سے سنو۔ میں تمہیں تمہارے کام کے بارے میں لیکچر نہیں دینا چاہتا۔" بابر نے بے پروائی سے کہا "لیکن ایک مشورہ سن لو۔ یہ جو دو روشنیاں نظر آرہی ہیں' تمہیں جہاز کو ان کے عین درمیان لینڈ کرنا ہے۔ ذرا سی غلطی کروگے تو جہاز سڑک بنانے والے آلات سے ٹکرائے گا' جو اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں اور اگر نسبتاً آگے لینڈ کیا تو لینڈنگ کی پٹی چھوٹی پڑجائے گی۔ ٹھیک لینڈنگ کی صورت میں بھی انجن ریورس کرکے بریک پر کھڑے ہوجانے میں عافیت ہوگی۔ رن وے چھوٹا پڑ سکتا ہے۔"

"اس کی چوڑائی کتنی ہے؟"

"میں پورا حساب لگا چکا ہوں۔ پہیوں کے دونوں طرف دو فٹ فاضل سڑک ہوگی۔"

کیپٹن نوید کو غصہ آگیا۔ "خواہ مخواہ چار فٹ سڑک ضائع کردی تم نے۔ ارے..... دونوں طرف دو دو فٹ فاضل سڑک کی کیا ضرورت تھی۔ بڑے ایکسپرٹ بنتے ہو۔ نہیں جانتے کہ بریک لگانے سے پہلے جہاز تین چار فٹ اِدھر اُدھر ضرور ڈولتا ہے اور میرے لیے تو یہ جہاز بھی نیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کے بریک کیسے ہیں۔"

"یہ تمہارا دردِ سر ہے کیپٹن اور ہاں..... سڑک زمین کے مقابلے میں تین فٹ بلند ہے۔"

نوید زیرِ لب بڑبڑایا۔ پھر بولا "اب تو جہاز کو سڑک پر رکھنا اور ضروری ہوگیا ہے اور مسٹر بابر' اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ سڑک جہاز کو جھیل جائے گی۔ پھٹ نہیں جائے گی۔ مجھے تو یقین نہیں آسکتا....."

"یہ سڑک پاکستانی نہیں' کوریا والے بنا رہے ہیں۔" بابر نے کہا "میں نے اس کے انجینئر سے بات کی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ روڈ جہاز جتنے وزن کو جھیل سکتی ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں نے اس سے جہاز کا پوچھا تھا۔ میں نے بس وزن تجویز کرتے ہوئے پوچھا تھا کہ اتنے دباؤ پر روڈ کی کیا کیفیت ہوگی۔ اس نے کہا کہ سڑک بس کہیں کہیں سے معمولی سی چٹخ سکتی ہے ایسی کہ اس کی مرمت میں زیادہ دیر بھی نہیں لگے گی....."

"یہ غلط ثابت ہوا تو وہ ہم سب کو سڑک کے ساتھ دُھلوادیں گے اور کنارے پر بورڈ لگادیں گے' اس سڑک کو کریش ٹیسٹ کرلیا گیا ہے۔" نوید نے چڑ کر کہا۔

"میرا خیال ہے' اب تم زبان کی تیزی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے لینڈنگ کی فکر کرو۔"

○☆○

کمال نے پہیے کھلنے کی آواز سنی تو چونک گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ جہاز کی رفتار کم ہو رہی ہے۔ اس کا جسم تن گیا۔ کاش ۔۔۔ جہاز اڑتا ہی رہے۔ اس نے سوچا۔ یہ خیال بہت آہستگی سے ابتدا میں اور پھر تیزی سے اس کے ذہن میں در آیا کہ اب زندگی کا آخری باب لکھا جانے والا ہے اور اس کی سانسیں بس گنی چنی رہ گئی ہیں۔ اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ کاش وہ یہاں سے اُڑ کر اپنے کلاس روم میں پہنچ جائے۔ مختلف موضوعات پر اپنے طلبا سے تبادلۂ خیال کرے۔ فیکلٹی روم میں بیٹھ کر پی ٹی آئی مظفر خان کے ساتھ کافی اور سگریٹ پیے۔ زندگی اتنی خوبصورت ہے۔ کون اسے چھوڑنا چاہے گا۔ وہ دھوپ کو اپنے جسم پر اور صبح کی شبنم کو اپنے پیروں تلے محسوس کرنا چاہتا تھا۔

اس کے اندر ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ احساسات جنہیں اس نے اب تک دبائے رکھا تھا اس لیے کہ وہ ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ کر بے بسی سے موت کی آغوش میں نہیں اُترنا چاہتا تھا اور اس لیے کہ زندگی بڑی پیاری' بڑی خوبصورت چیز تھی لیکن اب موت کو بہت قریب جان کر وہ سب اُبھر آئے تھے۔

بابر نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا "کمال رشید... بس تھوڑی دیر اور....."

"کمال نے صرف ایک لفظ کہا اور بڑی شدت سے کہا۔

"نہیں۔"

بابر رکا' اس کی طرف واپس آیا اور حیرت سے کہا۔ "کیا!"

کمال اب پرسکون تھا۔ اس کے اندر بھی وہ اعتماد تھا جو اس کے لفظوں میں جھلک رہا تھا۔ "میں نے نہ مرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں تمہیں روکوں گا۔"

"اتنے کڑے وقت میں یہ حسِ مزاح حیرت انگیز ہے۔" بابر نے کہا پھر وہ پلٹ کر چل دیا۔

کمال نے اپنے اندر لاوے کی طرح کھولتے ہوئے غصے کو دبایا۔ غصے کو اور اس کے ساتھ ایک توانا لیکن غیر منطقی خوف کو

بھی۔ اس نے صورتِ حال کا حقیقت پسندانہ انداز میں تجزیہ کرنا شروع کیا۔ یہ بات طے تھی کہ وہ چاروں مرجائیں گے لیکن انصاف کا تقاضہ تھا کہ وہ زندہ رہیں اور بابر اور اس کے ساتھیوں کو قرار واقعی سزا ملے۔ ٹی وی کے ڈراموں میں تو یہی ہوتا ہے۔ آخری فتح حق کی ہوتی ہے۔ باطل کچلا جاتا ہے لیکن وہاں تو سب کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ کہیں سے کسی امداد کے ملنے کا امکان نہیں تھا۔ صوفیہ بہت دیر پہلے کوما سے ملتی جلتی کیفیت میں تھی۔ ایک اعتبار سے یہ بہتر ہی تھا۔ اگر وہ سب ایسی ہی بے حسی اور بے خبری کی محفوظ باہوں میں سماجائیں تو موت کا خطرہ بے معنی ہوجائے گا۔ سارا عذاب توبس سوچنے کا ہے۔ موت کی اذیت تو موت کے خوف کی طوالت میں ہے' اس سے نجات پالی جائے تو کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔ ابھی وہ موت کی حدود میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ موت بس ان کے ذہنوں میں ایک مبہم خطرے کی طرح تھی۔ اب جو اس سے بے نیاز تھا' وہ فائدے میں تھا اور جو تصور میں اس کی جزئیات سے بھرپور شبیہہ تخلیق کررہا تھا' وہ عذاب میں تھا۔

اسے ان لوگوں پر غصہ آنے لگا' جن کی ذمّے داری تھی کہ انہیں آزاد کرائیں اور مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچائیں۔ کہاں ہیں وہ لوگ؟ آتے کیوں نہیں غیر ذمّے دار کہیں کے۔ کیا شیطنت کے پجاری بابر نے انہیں اس طرح انگلیوں پر نچایا ہے کہ ان کے دماغ بیکار ہوگئے ہیں۔ ذہانت جواب دے گئی ہے؟ کیا وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس بگڑے ہوئے معاشرے میں اب بُرا آدمی نیکی پر غالب آنے لگا ہے' فتح یاب ہونے لگا ہے! جرم کا درخت پھولوں اور پھلوں سے لد جاتا ہے۔ دنیا اب ایک جنگل ہے' جہاں صرف طاقت کا قانون چلتا ہے۔ بابر کے روّیے سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ بدی کے کردار میں خوش ہے.... اور وہ اس کے.... کمال رشید کے کردار سے بھی خوش ہے کہ اسے کچل کر وہ اپنی برتری اپنی چالاکی' ثابت کرسکے گا۔ نیکی کے کردار کو کچل کر! درست..... کیونکہ اس ڈرامے میں دو ہی کردار ہیں۔ فعال کردار..... صوفیہ کو توشاک نے اس حد تک بے حال کردیا ہے کہ وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتی۔ مشکور اور نذیر دولت کے پجاری اور دہشت گرد کے کھلونے ہیں۔ انہیں صورتِ حال کا شعوری ادراک نہیں ہے۔ ان دو معصوم لڑکوں کی طرح' جو بس یہ توقع کررہے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اس ابتلا سے ان کی جان چھوٹ جائے گی۔ باقی کون بچا؟ بس وہ دونوں.... کمال اور بابر۔ وہ ہی سمجھ سکتے تھے کہ یہ ذہن کی طاقت اور قوتِ ارادی کی سربلندی کا کھیل ہے۔ جب تک اس معاملے میں دوسرے کو شکست نہیں دی جائے گی۔ بازی نہیں جیتی جاسکتی۔ سو وہ دونوں شطرنج کی بساط پر انسانی جانوں کے مہرے رکھ کر بازی کھیل رہے تھے۔

صوفیہ اور دونوں لڑکوں کو موت کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا لیکن کمال جانتا تھا۔ اسے بابر دھکیلتے دھکیلتے زندگی کے پہاڑ کی اس کگر تک لے گیا تھا' جس سے ایک پل کے فاصلے پر موت کی مہیب کھائی تھی۔ وہ دیر سے اس کگر پر کھڑا تھا اور بابر اسے اس کے پیروں اور کھائی کی طرف دیکھنے پر مجبور کرتا تھا۔ صوفیہ' مظفر اور رئیس نے موت کے بارے میں سوچا بھی ہوگا تو یوں جیسے کوئی فنتا سی۔ انہوں نے اس کے خدو خال تو نہیں دیکھے تھے۔

اس ڈرامے کا حاصل کیا تھا؟ کچھ بھی نہیں! یہی اس اسٹرائی ڈرامے کا سب سے مضحکہ خیز پہلو تھا۔ بابر ان سب کے ساتھ ایک ایسا کھیل کھیل رہا تھا' جس سے آخر میں صرف اتنا ثابت ہوتا کہ وہ اس ڈرامے کے تمام کرداروں سے شیطنت کے معاملے میں بہت آگے تھا۔ سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ اس معاملے میں کسی نے اسے چیلنج بھی نہیں کیا تھا۔ یہ ٹائٹل تو وہ بلا مقابلہ جیت سکتا تھا۔ یہ بات تو خود کمال بھی ہر وقت تسلیم کرنے کو تیار تھا لیکن بابر اسے عملی طور پر ثابت کرنا چاہتا تھا۔ وہ اذیتیں دے کر ثابت کرنا چاہتا تھا کہ شیطنت سب سے بڑی طاقت ہے۔ یہاں اسے چیلنج کیے بغیر نہیں رہا جاسکتا تھا۔ یہ تو اللہ کے سامنے غداری ہوتی۔ بابر اپنی فیصلہ کن فتح کے نشے میں سرشار تھا۔ یہ خیال اسے آیا بھی نہیں ہوگا کہ کہانیوں' داستانوں کی طرح ہیرو غیر معمولی طاقت کا مظاہرہ کرکے بساط پلٹ بھی سکتا ہے۔ دشواری یہ تھی کہ حقیقت میں ایسا بہت بڑے لوگوں نے کرکے دکھایا تھا۔ ورنہ عام طور پر یہ قصے کہانی کی باتیں تھیں۔

کمال کو اپنی ہذیانی اور بے ترتیب سوچوں پر خود ہنسی آنے لگی لیکن یہ سچ تھا کہ وہ ایسا ہی کچھ کرنا چاہتا تھا۔ یوں مرجانا تو بہت آسان تھا مگر موت کو اٹل حقیقت جان کر بہت کچھ کیا جاسکتا تھا۔ کم از کم کوشش تو کی ہی جاسکتی تھی مگر کچھ کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اس کی ایک سوچ تھی۔ وہ موت سے پہلے مرجانے کو اپنے ہاتھ دوسروں کے خون سے آلودہ کرکے زندہ رہنے سے بہتر سمجھتا تھا مگر اب اسے اس سوچ کو رد کرنا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اسے زندگی زیادہ عزیز تھی بلکہ اس لیے کہ یہ سوچ تھی ہی غلط۔ بدی اور نیکی کی جنگ میں نیکی کو ہتھیار اُٹھانے ہوتے ہیں۔ بدی کا خاتمہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ جہاد ہے۔ زندہ تو غازی' مرے تو شہید۔ انسانی خون بہانا بے شک بُری بات ہے لیکن انسان اگر شیطان کا آلۂ کار بن جائے تو اس کا خون بہانا ہر اچھے انسان پر فرض ہے۔

پہلی بار اسے تقویت کا احساس ہوا۔ روح کو توانائی مل جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ اس بدصورت اور مکروہ شخص کو' جو انسان کے روپ میں شیطان ہے' صفحۂ ہستی سے مٹانا ضروری ہے۔

○☆○

کیپٹن نوید نے ہاتھ کی پشت سے پیشانی کا پسینہ پونچھا پھر اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھایا اور جہاز کے کنٹرول تھام لیے۔ اسے کنٹرولز میں ارتعاش محسوس ہوا۔ درحقیقت پورے جہاز میں جیسے

زلزلہ سا آیا ہوا تھا۔ اس نے جہاز کی ہوا میں اسپیڈ کی کمی کے سدِّباب اور اسے زمین پر گرنے سے بچانے کے لیے مزید پاور دی۔ وہ بہت آہستگی سے اور بتدریج جہاز کو نیچے اتار رہا تھا۔ جہاز ایک ایک انچ کا فاصلہ طے کرنے کے لیے زور لگاتا محسوس ہو رہا تھا۔ ہوا میں رہنے کی جدوجہد میں جہاز کا ہر حصہ بج رہا تھا۔ اس کا اپنا جسم تنا ہوا تھا۔ جبڑے اس نے بھینچ لیے تھے۔ جیسے وہ جہاز کو دو روشنیوں کے عین درمیان اُتارنے کی جسمانی کوشش کر رہا ہے اور اُتارنا بھی بے حد آہستگی سے تھا۔

اس کی آنکھیں دونوں روشنیوں کی درمیانی پٹی پر زور دیتے دیتے تھک گئیں۔ وہ اس کے مرکز کے بارے میں درست ترین اندازہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاکہ دونوں طرف کے پہیوں میں سے کسی کے بھی باہر جانے کا خطرہ نہ رہے۔

بہت نیچے پہنچ کر اس کی نظر سڑک تعمیر کرنے والے آلات کے انبار پر پڑی تو اس پر خوف طاری ہو گیا۔ جہاز ان کے بالکل برابر سے گزرا تھا۔ اس نے جہاز کو مزید پاور دی اور فلیپ اٹھاتے ہوئے جہاز کو بڑے ہموار انداز میں روشنیوں کے عین درمیان اُتار لیا پھر اس نے بڑی پھرتی اور قوت سے تھروٹل کو اپنی طرف کھینچا۔ اس کا جسم سیٹ کی پشت گاہ سے ٹکرایا۔ اس نے بریک لگائے۔ جہاز بائیں جانب جھکتا محسوس ہوا۔ اس نے سیٹ سے ٹیک لگاتے ہوئے' بریک پر جسم کا پورا دباؤ ڈالا اور ہاتھ سے لرزتے ہوئے کنٹرول کو سنبھالا۔ نامانوس دباؤ کے تحت جہاز بری طرح لرز رہا تھا اور عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں۔ جہاز تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا اور وہ بریک پر مزید دباؤ اس خوف سے نہیں ڈال رہا تھا کہ کوئی ٹائر نہ اڑ جائے۔

روشنیاں تیزی سے گزر رہی تھیں اور وہ خوفزدہ تھا۔ آخری دو روشنیاں رہ گئیں تو اسے احساس ہوا کہ جہاز رک رہا ہے۔ اب اس نے بریک پر دونوں پیروں سے دباؤ ڈالا۔ بریک لاک ہوئے۔ سڑک سے ربر کے ٹکرانے کی چیختی آواز سنائی دی اور جہاز رک گیا۔ اس نے جھٹکے سے بریک سے پاؤں ہٹائے۔ جہاز کئی فٹ آگے بڑھا۔ اس نے نوز وہیل کو سڑک سے سلپ ہوتا محسوس کیا پھر جہاز کی نوز نیچے جھک گئی۔

بابر نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی "شاندار لینڈنگ۔ میں تمہیں بتانا بھول گیا تھا کہ روشنیوں کے اختتام پر سڑک خم کھاتی ہے لیکن تم نے خود دیکھ لیا۔"

کیپٹن نوید اپنی سیٹ پر ساکت وصامت بیٹھا تھا۔ اس کا پورا جسم پسینے میں نہا رہا تھا۔ اس نے آنکھوں میں اُتر جانے والے پسینے کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ اسے اپنے اعصاب کو پُرسکون کرنے میں ایک منٹ لگا۔ "مسٹر بابر۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "تم خوش قسمت ہو کہ میں غیر معمولی پائلٹ ہوں۔ ورنہ ہم سب مر چکے ہوتے۔ اب میں جہاز کو بند کر کے روشنی کر رہا ہوں۔ تمہیں بھلا لگے یا بُرا۔ مجھے کوئی پروا نہیں۔"

○☆○

روشنی ہوئی تو کمال کو لگا کہ وقتی طور پر وہ اندھا ہو گیا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور انہیں روشنی سے ہم آہنگ کرنے کے لیے بار بار پلکیں جھپکانے لگا۔ جہاز کے اندر کا ماحول اسے غیر حقیقی لگ رہا تھا۔ جیسے سب کچھ پلاسٹک کا بنا ہو اور موجود لوگ موی مجسمے ہوں۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ اس نے صوفیہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر تناؤ تھا اور رنگت سپید پڑ گئی تھی۔ وہ واقعی ساکت بیٹھی کوئی مجسمہ ہی لگ رہی تھی۔ ساتھ والی سیٹ پر رئیس اور مظفر بھی ساکت بیٹھے تھے۔ حد یہ کہ نذیر کا بھی یہی حال تھا۔

اچانک جہاز کے باہر ایک دھماکا ہوا۔ جہاز میں موجود سب لوگ گھبرا گئے پھر عقبی دروازہ کھلا اور آوازوں سے لگا کہ کچھ لوگ اوپر چڑھ رہے ہیں۔ کمال نے اپنی تکلیف کو نظرانداز کر کے سیٹ پر پہلو بدلا اور لٹکے پردے پر نظریں جما دیں۔ ایسے پردے جہاز کو مختلف سیکشنوں میں تقسیم کرنے کے لیے تھے۔

پردہ ہٹا اور بابر سے ملتا جلتا ایک شخص اندر آیا۔ وہ عمر میں بابر سے بڑا لگ رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک دراز قد اور تنومند شخص تھا۔

مختصر الوجود شخص نے نذیر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ "اشوک کہاں ہے؟"

نذیر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "اشوک؟ کون اشوک؟"

پستہ قامت منحنی شخص کے چہرے کا تاثر ایک پل کو بدلا مگر اس نے فوراً ہی خود پر قابو پالیا۔ "میں بابر کو پیار سے اشوک کہتا ہوں۔"

نذیر اسے شک آمیز نظروں سے گھور رہا تھا۔ "وہ کیبن میں ہے۔"

"تم لوگوں نے کمال کر دیا۔" منحنی شخص بولا "ایسا کام اس ملک میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ جب تم لوگوں نے پولیس والوں کو ختم کیا تو میں سمجھا کہ کھیل ختم ہو رہا ہے... لیکن... بابر انہیں انگلیوں پر نچاتا رہا۔ واہ بھئی واہ۔ تم لوگ واقعی داد کے مستحق ہو۔"

"یہاں کی صورتِ حال کیا ہے؟"

"سب کچھ تیار ہے۔ ہم راولپنڈی سے ملتان جانے والی ویگن لائے ہیں۔ روٹ کی گاڑی ہے۔ مسافر بھی پورے ہوں گے۔ کسی کو شک بھی نہیں ہو سکتا۔ تمام انتظامات مکمل ہیں۔"

اس گفتگو نے کمال کو دہلا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ بابر اسے ختم کرنے کا تہیہ کر چکا ہے لیکن اب ثابت ہو رہا تھا کہ وہ تمام یرغمالیوں کو ختم کرنے کا تہیہ کر چکا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یہ گفتگو

ان کے سامنے نہیں کرتے۔

اسی لیے بابر کیبن سے نکلا۔ اس کے ہونٹوں پر بے حد کشادہ مسکراہٹ تھی۔ وہ منحنی شخص کی طرف بڑھا اور اس سے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ "کہو گوپال.... کیسی رہی؟"

منحنی شخص نے آنکھوں سے نذیر کی طرف اشارہ کیا۔"

"ارے، اب ان سے کیا پردہ۔" بابر نے کہا۔ "یہ ہمارے ساتھی ہیں۔ اب یہ کہیں اور تو نہیں جاسکتے۔"

"پھر بھی....."

"تم اس کی فکر نہ کرو۔" بابر نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"تت.... تو.... تو تمہارا نام اشوک ہے۔" نذیر بوکھلایا ہوا نظر آرہا تھا۔

"ہاں۔ میں اشوک ہوں اور یہ بیلا۔" اشوک نے شہلا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم ہندو ہو؟" نذیر کو یقین ہی نہیں آرہا تھا۔

"ہندو ہی نہیں، میں بھارتی ہوں۔ بھارت ماتا کا ادنیٰ سیوک۔"

نذیر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ کچھ دیر تو اس سے بولا ہی نہیں گیا پھر اس نے بمشکل پوچھا "اور شہناز؟"

"وہ شہناز ہی ہے۔"

"اور مشکور!"

"وہ بھی مشکور ہی ہے۔"

گوپال نذیر کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "اشوک... تم نے غلطی کی ہے۔ اب اس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔"

"کوئی بات نہیں۔ رائفل اس سے لے لو۔ غیر مسلح کردو اسے۔ زیادہ گڑبڑ کرے گا تو اس کا شمار بھی یرغمالیوں میں کرلیں گے۔" اشوک نے کہا۔ پھر وہ نذیر کی طرف مڑا۔ "تمہارا کیا خیال ہے۔ پانچ کروڑ میں سے اپنا حصہ لینا چاہتے ہو یا موت۔"

نذیر کو فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگی۔ اس نے وہ سب کچھ دولت ہی کے لیے تو کیا تھا۔ اس نے کہا "اشوک.... میں تمہارے ساتھ ہوں اور رہوں گا۔"

"دیکھا تم نے۔ میں ٹھوک بجا کر ساتھی بناتا ہوں۔" بابر نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ "تمہیں رقم دکھاؤں گا تو حیران رہ جاؤ گے۔"

"یہ بتاؤ، اب ہمیں کارکردگی دکھانے کا موقع کب ملے گا؟" گوپال نے پوچھا۔

"بہت جلد۔ منصوبے میرے پاس کئی ہیں۔ میں نے شہر کا انتخاب بھی کرلیا ہے۔ ہم اس سفر کی گرد بیٹھنے کا انتظار بھی نہیں کریں گے۔ یوں ان کا دھیان ہماری طرف سے ہٹ جائے گا۔"

وہ کچھ دیر آپس میں باتیں کرتے رہے پھر نذیر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے گوپال سے پوچھا۔ "ہماری ساتھی شہناز کا کیا ہوا؟"

گوپال بے تاثر چہرہ لیے اسے دیکھتا رہا۔ "وہ نہیں آسکے گی۔"

"کیوں؟" نذیر نے پوچھا۔

"پولیس والے اس تک پہنچ گئے تھے۔ اسے گولی لگی تھی پھر خبر آئی کہ وہ اسپتال میں مرگئی۔ شناخت کے لیے اس کی تصویر مسلسل ٹی وی پر دکھائی جارہی ہے۔"

نذیر کو یہ سن کر جھٹکا لگا۔ اس نے سیٹ کی پشت گاہ کو تھام کر خود کو سنبھالا۔ "اس نے زبان کھولی....؟"

"میرا خیال ہے نہیں۔ خبروں میں بتایا گیا تھا کہ پولیس آپریشن کے بعد اس سے پوچھ گچھ کرے گی لیکن وہ آپریشن کے دوران ہی مرگئی۔"

نذیر کے اندر کچھ ٹوٹ گیا۔ اس نے نئی زندگی کے خواب شہناز کے ساتھ مل کر دیکھے تھے۔ وہ مشترکہ خواب تھے اور اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس منصوبے پر عمل درآمد کے دوران اتنی خوں ریزی ہوگی۔ اس نے اکثر سوچا تھا کہ پولیس نے دھاوا بول دیا تو کیا ہوگا۔ مقابلہ ہوگا تو لوگ تو مارے جائیں گے۔ یہ اس کے لیے قابل قبول تھا مگر نازیہ کی موت نے اسے ہلا دیا تھا۔ اس کے نزدیک وہ غیر ضروری تھی۔ اس کو نہیں مارنا چاہئے تھا اور اب شہناز! وہ بدنصیب دکھی عورت، جو ہمیشہ لٹتی رہی اور آخر میں اس کے خوابوں کے ساتھ اس کی زندگی بھی لٹ گئی۔

پھر اس نے سوچا، اچھا ہی ہوا جو وہ مرگئی۔ اسے پتا چلتا کہ شہلا بیلا ہے اور بابر اشوک تو کیا ہوتا۔ وطن دشمنوں کا آلۂ کار بننے کا داغ اس نے تو دولت کی خاطر قبول کرلیا تھا لیکن شہناز شاید یہ برداشت نہ کرپاتی اور نتیجتاً اشوک کے ہاتھوں ماری جاتی۔ انجام شاید یہی ہونا تھا اس کا۔

اشوک کیبن کی طرف جارہا تھا۔ نذیر نے راستے میں اسے روک لیا۔ "سنو اشوک، ان لوگوں کو ختم کرنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔ "ہم پہلے ہی کافی لوگوں کو ختم کرچکے ہیں۔ ان لوگوں کا قتل ہمارے مستقبل کے منصوبوں کے لیے تباہ کن ہوگا۔ اگر لوگوں کو یہ یقین ہو کہ یرغمالیوں کو ہر حال میں مارے جانا ہے تو ہمارے مطالبات وہ کیوں تسلیم کریں گے۔"

اشوک استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ "میری حقیقت جاننے کے باوجود تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میرا مقصد بھاری زرِ تاوان وصول کرنا ہے۔ ارے بے وقوف، میں اس ملک میں انارکی پھیلانا چاہتا ہوں۔ میرا مقصد لوگوں کو عدم تحفظ کا احساس دلانا ہے۔ رقم تو بونس ہے میرے لیے۔"

"اس کے باوجود اگر تم نے یہ تاثر قائم کردیا کہ تم مطالبات پورے ہونے پر بھی یرغمالیوں کی جاں بخشی کے قائل نہیں ہو تو اگلا آپریشن ہمارا آخری آپریشن ہوگا۔ وہ ہمیں ختم کردیں گے۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو نذیر۔" اشوک نے سرد لہجے میں کہا "دراصل تم کمزور آدمی ہو..... بہت کمزور۔ جہاز کا عملہ اور چاروں یرغمالی... سب کو مرجانا ہے۔ تم چاہو تو انہیں بچانے کی کوشش

کردیکھو۔ بس ایک لاش کا اور اضافہ ہوجائے گا۔ تمہاری لاش کا۔ کیا یہ تمہارے خیال میں مناسب سودا ہے؟"

نذیر کی نظریں جھک گئیں۔ وہ پہلے دن سے ہی خود کو اشوک کے سامنے بے بس محسوس کرتا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا "میں ایسی کوئی کوشش نہیں کروں گا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" اشوک نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "اب تم ایسا کرو کہ ایکسپلوزیوز کو لے کر نیچے اترو اور ویگن سے چار سوٹ کیس نکال کر یہاں لے آؤ پھر جا کر ویگن اسٹارٹ کرو۔ ہم رقم نئے سوٹ کیسوں میں منتقل کریں گے اور پھر چل دیں گے۔ اس کے بعد تم محفوظ ہوگے۔"

"ٹھیک ہے۔" نذیر نے کہا اور پلٹا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

"اور جلدی کرنا۔"

نذیر نے ایکسپلوزیوز اٹھائے اور عقبی حصے کی طرف چل دیا۔ وہ یرغمالیوں سے نظریں چرا رہا تھا۔ کمال کی نگاہوں میں اس کے لیے کھلی نفرت تھی۔

اسی لمحے اشوک کیبن کے دروازے پر نمودار ہوا۔ "نذیر... ویگن کو جہاز کے قریب ہی لے آنا۔ سوٹ کیس منتقل کرنے میں آسانی رہے گی۔"

نذیر نے سر کو تفہیمی جنبش دی اور چلتا چلا گیا۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ جہاز کے دروازے سے سیڑھی لگی ہوئی تھی۔ اُترنے سے پہلے اس نے ڈائنامیٹ کے دونوں پیکٹوں کو سیڑھی کی سائیڈ میں جہاز کے پاس گرادیا۔ وہ ریڈیو کی مخصوص فریکوئنسی پر سیٹ ہونے کی وجہ سے عام حالات میں بے ضرر تھے۔

ویگن میں آٹھ افراد بیٹھے تھے۔ وہ واقعی مسافر ہی لگ رہے تھے لیکن نذیر جانتا تھا کہ وہ دوسرے اور تیسرے یونٹ کے اراکین ہیں۔ اب وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ یونٹ دہشت گردی کے یونٹ ہیں۔ را کے تربیت یافتہ ایجنٹوں کو تخریب کاری اور دہشت گردی کے لیے بھارت سے پاکستان بھیجا گیا ہے۔

اس نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ "وہ پورے مسافروں کی ویگن تھی۔ وہ پندرہ سیٹیں تھیں۔ آٹھ افراد ویگن میں موجود تھے۔ دو اوپر جہاز پر تھے اور چار وہ خود تھے۔ مشکور، وہ خود، بملا اور اشوک۔ بملا اور اشوک اب بھی اسے اجنبی اور نامانوس نام لگ رہے تھے۔

○☆○

چمکیلی روشنیوں میں جہاز کا ماحول مصنوعی اور سرد معلوم ہو رہا تھا۔ کمال کا عجیب حال تھا۔ لینڈنگ نے اس کے نڈھال جسم کے ساتھ اور ظلم کیا تھا۔ انجر پنجر ڈھیلے ہوگئے تھے۔ اب وہ آہستگی سے سنبھل رہا تھا لیکن اس انکشاف نے کہ یہ کارروائی درحقیقت را کے ایجنٹوں کی ہے، جس میں انہوں نے پاکستانیوں کو بھی استعمال کیا ہے، اس کے بدن میں بجلیاں سی بھر دی تھیں۔ اس سے پہلے اس خیال نے کہ اس کے ہم وطن بھی ایسے سفاک ہوسکتے ہیں، اس کے مورال کو تباہ کردیا تھا مگر اب اس کے اندر ایک نیا عزم، نیا حوصلہ جاگ رہا تھا۔ وہ دہشت گردوں کو دیکھتا رہا، جو پُرسکون انداز میں اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ یوں وہ لینڈنگ کے نتیجے میں منتشر ہونے والے اعصاب کو ٹھیک رہے تھے۔

کمال کو معلوم ہوگیا تھا کہ جہاز پر موجود دہشت گردوں میں دو ہندوؤں کا اضافہ ہوگیا ہے۔ نیچے شاید اور بھی کئی ایک موجود ہوں، لیکن اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ کسی طرح مظفر یا رئیس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ یہ ضروری تھا کہ اس بات کا دہشت گردوں میں سے کسی کو احساس نہ ہو۔ چنانچہ وہ کسی مناسب موقعے کا منتظر تھا۔ ان لوگوں کو روکنے کی کوئی کوشش اگر کرنی تھی تو اس کے لیے ضروری تھا کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار ہو اور چاقو کے سوا کچھ میسر نہیں تھا، جو رئیس کے پاس تھا۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ نذیر نیچے جاچکا تھا۔ اشوک دوسرے دو دہشت گردوں کے ساتھ جہاز کے عقبی حصے میں تھا، جہاں زرِ تاوان کے سوٹ کیس رکھے تھے۔ مشکور کیبن میں تھا اور یہاں صرف بملا تھی۔ (کمال کو حیرت ہونے لگی کہ اس نے دہشت گردوں کے اصل ناموں کو کتنی آسانی سے قبول کرلیا تھا۔)

یہ مناسب موقع تھا۔ جیسے ہی مظفر نے اس کی طرف رخ کیا، اس نے مظفر کو اشارے سے بتایا کہ وہ رئیس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ مظفر نے رئیس کو بتایا اور رئیس اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اب وہ زبان سے بول نہیں سکتا تھا۔ سو وہ اشاروں میں رئیس کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ اسے چاقو کی ضرورت ہے۔ یہ مرحلہ خاصا دشوار تھا۔ بالآخر وہ اپنی بات سمجھانے میں کامیاب ہوگیا۔ رئیس اور مظفر درمیانی راستے کے دوسری طرف اس سے دو قطار آگے بیٹھے تھے۔ اگلا مرحلہ اور دشوار تھا۔ چاقو اِدھر سے اُدھر کیسے کیا جائے۔

ابھی کمال کوئی ترکیب سوچ ہی رہا تھا کہ رئیس نے بڑی سادگی سے مسئلہ حل کردیا۔ وہ اٹھا اور پیچھے کی طرف چل دیا۔ کمال کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے چاقو کمال کی گود میں گرادیا۔ کمال نے تیزی سے اسے ہاتھ سے چھپالیا۔

بملا کا ردِعمل بہت تیز تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی اور رائفل کا رخ رئیس کی طرف کیے اس کی طرف بڑھی۔ "کیا بات ہے؟ مرنا چاہتے ہو؟" وہ غرائی۔

"نہیں۔ ہاتھ پاؤں کھول رہا ہوں۔ بالکل اکڑ کر رہ گئے ہیں۔" رئیس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چلو اپنی جگہ بیٹھ جاؤ۔ تمہارے ہاتھ پیروں کو اب کھلنے کی ضرورت نہیں۔"

رئیس اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ بملا کمال کو شک آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی لیکن چاقو اسے نظر نہیں آیا تھا۔

کمال نے اپنی سیٹ سے ٹیک لگائی اور پاؤں پھیلا کر بیٹھتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کا ہاتھ اندر ہی اندر چاقو کو کھول رہا تھا۔ اب وہ ایک خاص آواز کا منتظر تھا۔ بلا کے پلٹنے کی آواز کا۔ جیسے ہی اسے وہ آواز آئی۔ اس نے چاقو نکالا اور اٹھ کر اس کی طرف جھپٹا۔ بلا کی پشت اس کے سامنے تھی۔ چاقو کے بلیڈ کو بلا کے گُردے میں دھنس جانا تھا لیکن عین موقعے پر ایک رائفل کی نال نے مداخلت کی۔ نال اس کی کلائی سے ٹکرائی۔ چاقو ہاتھ سے چھوٹ کر اُڑا اور چند قطار دور کسی سیٹ کے نیچے جاگرا۔ خود کمال سیٹوں کے درمیان والی جگہ میں گر گیا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا تھا۔

وہ کوشش کرکے اُٹھا۔ تب اس نے دیکھا کہ کام بگاڑنے والا کون تھا۔

اشوک کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا۔ "کمال رشید..... بس اتنا ہی کرسکتے ہو تم۔ اتنی ہی سوچ ہے تمہاری۔ اس طرح تم چھ مسلح افراد کو کیسے روک سکتے ہو۔ مجھے مایوسی ہوئی ہے۔"

کمال اپنی سیٹ پر ڈھیر ہوگیا۔ جسم میں پھر ٹیسیں اُٹھنے لگی تھیں۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں مایوس کیا۔"

"سب سے بڑی بات یہ کہ تم ایک کمزور لڑکی پر پیچھے سے وار کررہے تھے۔ مجھے تم سے کسی ہیرو کے سے طرزِ عمل کی توقع تھی۔"

"کمزور لڑکی۔" کمال نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "دہشت گردی کی کوئی جنس نہیں ہوتی۔ را کی تربیت یافتہ لڑکی کمزور کہلائے گی؟"

"خیر تم نے مجھے مایوس بھی نہیں کیا۔ اتنی نامساعد صورتِ حال میں تمہاری یہ کوشش ثابت کرتی ہے کہ تم مرنا نہیں چاہتے۔ اب تمہیں مارنے میں لطف آئے گا۔"

بدلے ہوئے لہجے کو محسوس کرکے کمال نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ جو کچھ وہاں دکھائی دیا' اس نے اس کے جسم میں سرد لہر دوڑادی۔ اشوک کا چہرہ سخت نقاب کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ یہ وہی تاثر تھا جو اس وقت اس کے چہرے پر نظر آیا تھا' جب اس نے پچھلی بار اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔

رائفل کی نال کمال کی ٹھوڑی کے نیچے نرم عضلات میں دھنس رہی تھی۔ اشوک نے اور دباؤ ڈالا۔ کمال کا سر پیچھے کی طرف گیا۔

"اب.... اب میں تمہیں قتل کررہا ہوں۔" اشوک نے پھنکار کر کہا۔

کمال نے اپنے حلق پر موجود دباؤ کم کرنے کے لیے سر کو اور پیچھے ہٹایا لیکن رائفل بھی ساتھ ساتھ آئی تھی۔ اس کوشش کے نتیجے میں اس کے زخمی کندھے اور بازو میں اذیت کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے رائفل ہٹانے کی غرض سے اپنا سیدھا ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ رائفل کی نال کے وار نے سُن کردیا ہے وہ اسے اٹھا نہیں سکا۔ اس نے صوفیہ کو دیکھا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ یقینی طور پر شاک کی حالت میں تھی۔

کمال نے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور پُرسکون ہوگیا۔ اب زندگی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اسے خوشی تھی کہ اسے آخری لمحوں میں کلمہ پڑھنے کا' اللہ کو یاد کرنے کا اور توبہ کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ صرف اس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔

ایک لمحے کو اس نے تصور کیا کہ گولی چلی ہے اور وہ مرگیا ہے لیکن درحقیقت کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ چند لمحے بعد اسے اشوک کی ہسٹریائی ہنسی سنائی دی پھر اس نے کہا۔ "کمال رشید! ابھی تم پوری طرح نہیں پکے ہو اور مجھے کچا پھل توڑنا اچھا نہیں لگتا۔ ابھی میں تمہیں کچھ وقت اور دوں گا۔ تم پک جاؤ گے بالآخر۔" رائفل جھٹکے سے ہٹائی گئی۔ کمال کی ٹھوڑی سینے سے جا لگی پھر قہقہے کی آواز دور جانے لگی۔

کمال نے آنکھیں کھول دیں۔ "اسے مجھے مار دینا چاہیے تھا۔" وہ بڑبڑایا۔ انداز خود کلامی کا سا تھا۔ "اب یہ پچھتائے گا کہ اس نے یہ موقع کیوں ضائع کیا۔" ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ جو کچھ ہوچکا ہے' اس کی روشنی میں اس کی یہ دھمکیاں بے معنی ہیں۔ خالی خولی۔ ساتھ ہی اسے یہ احساس بھی ہوا کہ اس نے جو کوشش کی تھی' وہ بھی بے معنی ہی تھی۔ اشوک نے درست کہا تھا کہ اس طرح وہ چھ مسلح دہشت گردوں پر قابو نہیں پاسکتا۔ واقعی.... اگر وہ بلا پر وار کر بھی دیتا تو کیا ہوتا۔ اس نے آگے کے بارے میں تو کچھ نہیں سوچا تھا۔ اس کے پاس آئندہ کے لیے بھی کوئی مکمل لائحہ عمل ہونا چاہیے تھا۔

اس نے سر گھمایا اور سیٹوں کے درمیانی راستے میں کھڑی بلا کو گھورنے لگا۔ اس نے سوچا کہ فیصلہ میرا غلط بہرحال نہیں تھا۔ دہشت گردی کی زنجیر کی سب سے کمزور کڑی بلا ہی تھی اور اس کے پاس دو چیزیں تھیں' جو طاقت کا توازن تقریباً برابر کرسکتی تھیں۔ اس کی رائفل اور بیلٹ سے لٹکتے ہوئے دستی بم۔ وہ اپنے داہنے ہاتھ کو ہلانے لگا تاکہ وہ کارآمد ہوجائے۔ اس نے سوچا' اگر یہ چیزیں مجھے میسر ہوں تو.... یہ سوچ کر وہ مسکرایا۔ واقعی... اشوک نے مجھے زندہ چھوڑ کر جو غلطی کی ہے' وہ مہلک ثابت ہوسکتی ہے۔

ذرا دیر بعد اشوک واپس آیا۔ وہ بہت اچھے موڈ میں تھا۔ اس نے چیخ کر منگلور کو حکم دیا کہ وہ عملے سے چھٹکارا پالے پھر وہ گوپال اور دوسرے ساتھی کے ساتھ جہاز کے عقبی حصے میں چلا گیا۔ وہ انہیں دولت دکھاتے ہوئے اسے دوسرے سوٹ کیسوں میں منتقل

کرنا چاہتا تھا۔

اب وہاں صرف بلا تھی۔ رائفل لیے وہ بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ لگتا تھا' نروس ہے۔ کمال نے سوچا' یہ اس کے لیے قطعی طور پر آخری موقع ہے۔ اب اسے کچھ کرنا تھا۔ یہ اس کا فرض تھا۔ اسے ادا کر دیتا تو وہ سرخروئی سے مر سکتا تھا۔ اب اسے غم نہیں تھا کہ وہ خون بہانے کا اپنا عہد توڑ رہا ہے۔ اب وہ پھر سے پاک فوج کا جوان تھا اور یہ میدانِ جنگ تھا۔ ہمیشہ کی طرح دشمن کو عددی برتری بھی حاصل تھی اور وہ بہترین اسلحے سے لیس بھی تھا۔

اسی وقت کیبن کی طرف سے ایسی آواز سنائی دی' جیسے ہاتھاپائی ہو رہی ہے پھر کیپٹن نوید کی گونج دار آواز سنائی دی۔ "کیا مطلب؟ کیا کرنا چاہتے ہو تم؟"

چند لمحے توقف رہا پھر مشکور نے جواب دیا۔ "بابر نے مجھے حکم دیا ہے کہ تم لوگوں کو ختم کردوں۔"

شہلا مضطربانہ انداز میں انچ انچ کرکے کیبن کی طرف بڑھنے لگی پھر وہ رُک گئی۔ عین کمال کی سیٹ کے پاس!

پھر اچانک ایک سماعت شکن دھماکا ہوا۔ جہاز میں ہونے والی ہر سرگرمی رک گئی۔ جہاز میں موجود تمام لوگوں نے خود کو اوپر اٹھتا محسوس کیا۔ جہاز اپنے بائیں ونگ پر اٹھنے لگا تھا۔ پھر وہ دائیں جانب جھکنے لگا۔ اس کے بعد اس کے پہیئے نکلے اور وہ پیٹ کے بل بیٹھتا چلا گیا۔ دھماکا ہوتے ہی جہاز میں اندھیرا ہو گیا تھا۔ بس کھڑکیوں کے باہر نارنجی رنگ کی بہت چمک دار روشنی ہو رہی تھی' جس سے جہاز میں بھی اندھیرا نہیں رہا تھا۔ کمال نے خود کو اوپر اُٹھتے اور پھر جھٹکے سے نیچے گرتا محسوس کیا۔ گونج دار آواز جتنی تیزی سے اُبھری تھی' اتنی ہی تیزی سے معدوم ہو گئی۔ جہاز میں بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔ خاص طور پر عقبی حصے میں۔ لوگ چیخ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے۔

پھر ایک اور دھماکا ہوا اور آواز سے اندازہ ہوا کہ آگ بھڑکی ہے۔ شاید کوئی فیول کی ٹنکی پھٹی تھی.....!

○☆○

نذیر نے ویگن اسٹارٹ کی اور اسے جہاز کے پاس سیڑھیوں کے برابر لاکر کھڑا کر دیا۔ ویگن میں نسبتاً چھوٹے آٹھ سوٹ کیس تھے۔ عام سوٹ کیس جیسے مسافروں کے پاس ہوتے ہیں۔ اس نے وہ سوٹ کیس گوپال اور اس کے ساتھی کو دیے کہ جہاز پر پہنچا دیں۔

وہ پھر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ وہ پریشان تھا۔ جہاز سے اب کسی بھی لمحے فائرنگ کی آوازیں آسکتی تھیں۔ وہ اشوک کا شکر گزار تھا کہ اس نے اسے پیچھے بھیج دیا۔ اب اسے وہ قتلِ عام دیکھنا نہیں پڑے گا۔ دیکھنا تو کجا' وہ فائرنگ کی آواز بھی نہیں سننا چاہتا تھا۔ کاش وہ کسی طرح اس قتلِ عام کو روک سکتا لیکن وہ جان دے کر بھی نہیں روک سکتا تھا۔

اس نے ویگن میں نصب ریڈیو آن کر دیا۔ فضا میں ہلکی سی کھرکھراہٹ اُبھری۔ وہ کسی اسٹیشن کی تلاش میں ٹیونر گھمانے لگا۔ ڈائل کی طرف دیکھ کر سوئی آگے لے جاتے ہوئے اس کے ذہن میں کوئی بھولی بسری یاد چٹخنے لگی۔ اس نے سرخ سوئی کو دو نمبروں کے درمیان ٹھہرایا۔ ہلکی سی آواز ابھر رہی تھی۔ وہ سوچتا رہا کہ ذہن میں یہ خلش کیسی ہے۔ اس نے سوئی کو معمولی سا اِدھر اُدھر گھمایا تاکہ اسٹیشن صاف لگ جائے۔ آواز قدرے صاف ہوئی۔ چند الفاظ سنائی دیے لیکن کھرکھراہٹ اب بھی ہو رہی تھی۔

اچانک وہ اپنی جگہ ٹھٹھر کر رہ گیا۔ وہ اہم بات اسے یاد آگئی تھی۔ اس نے ریڈیو کے روشن ڈائل کو جھک کر دیکھا۔ اس کے بدترین خدشات کی تصدیق ہو گئی۔ اس نے سوئی کو اس خاص فریکوئنسی پر ٹھہرادیا تھا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیونر کو گھمانے کی کوشش کی لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ ڈائنامیٹ کے پیک خوف ناک دھماکے سے پھٹ گئے۔

○☆○

کمال نے سانس تک روک لی تھی۔ وہ دم سادھے بیٹھا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ غیر متوقع طور پر کچھ ہو گیا ہے پھر اچانک اسے خیال آیا کہ جہاز کسی بھی لمحے پھٹ سکتا ہے۔ اس کے رگ و پے میں خوف دوڑ گیا۔ وہ اندھیرے میں دم سادھے ایک اور دھماکے کا منتظر تھا کہ اچانک روشنی واپس آگئی۔

جہاز کے اندر کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ سوائے اس کے کہ بلا درمیانی راستے پر گر پڑی تھی اور اب اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیبن کی طرف سے مشکور کے ہکلانے کی آواز آرہی تھی۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عقبی حصے میں اشوک جانے کس پر برس رہا تھا۔ "اب یہ سوٹ کیس تو دور اُچھال دو۔ جہاز کی ٹنکی پھٹ گئی تو سب تباہ ہو جائے گا۔"

کمال کو پھر متلی کا احساس ستانے لگا۔ اس کے نتیجے میں جسم میں کمزوری کی لہر سی دوڑ گئی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا وجود پگھل رہا ہے۔ ہاتھوں اور ٹانگوں میں جیسے جان نہیں رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ کوئی نرم گرم بستر میسر ہو اور وہ سو جائے۔ اسے سکون کی ضرورت تھی۔

وہ کمزوری کے ہر احساس سے لڑ رہا تھا۔ ذہن سے باہر دھکیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ کمزوری کو قبول کرنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ خود کو یاد دلاتا رہا کہ اس پر کئی اعتبار سے ایک فرض عائد ہوتا ہے اور اسے وہ ادا کرنا ہے۔ بالآخر اس کے اندر ایک نامعلوم توانائی اور مضبوطی امڈنے لگی۔

کیبن کی طرف سے کیپٹن کی آواز سنائی دی۔ "اب تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری طرف سے کسی کو کوئی خطرہ لاحق ہو۔"

کمال کے ذہن سے دُھند چھٹنے لگی۔ اسے یاد آگیا کہ اسے کیا

کرنا ہے۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ بلا اٹھ چکی تھی اور اب لڑکھڑاتے قدموں سے کیبن کی طرف جانے کے ارادے سے بڑھ رہی تھی۔ ایسی پھرتی سے جو خود اس کے لیے بھی حیران کن تھی' کمال نے اپنے زخمی بازو کو سیٹ سے لپٹا کر گرفت بناتے ہوئے خود کو سیٹ سے اٹھایا اور بلا کی رائفل تھام لی۔ بائیں کندھے اور بازو پر گزرنے والی قیامت کا اسے احساس بھی نہیں تھا۔

بلا اور کمال ایک لمحے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ بلا کی آنکھوں میں چیلنج تھا۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ تم ایسا نہیں کرسکتے۔ تم عورت پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔ عورت کا خون نہیں بہا سکتے۔

کمال بھی اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ اب صورتِ حال بدل چکی ہے۔ اخلاقی تقاضے بدل چکے ہیں۔ شہلا نامی عورت کی بات اور تھی اور بلا نامی بھارتی دہشت گرد کی بات اور ہے۔ ویسے بھی اب تک جو کچھ ہو چکا تھا' اس کے بعد اس کے دل میں رحم کا شائبہ بھی موجود نہیں تھا۔ اب اور ستم کی اجازت نہیں دی جاسکتی تھی۔ وہ دہشت گردوں سے ان کے انداز میں نمٹنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔

اس نے زور لگاتے ہوئے جھٹکا دیا۔ بلا لڑکھڑاتی ہوئی پیچھے ہٹی۔ اس کا پاؤں پھسلا اور وہ گر گئی۔ رائفل اب کمال کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے رائفل سنبھالتے ہوئے اپنا پاؤں بلا کے پیٹ پر رکھ دیا کہ وہ اٹھ نہ سکے۔ بلا کے چہرے پر خوف تھا۔ اس کا ہاتھ تیزی سے اپنی بیلٹ کی طرف لپکا' جہاں دستی بم لٹکے ہوئے تھے۔ بلا کی اس غلطی نے کمال کو فیصلے پر پہنچنے میں مدد فراہم کی۔ کمال نے اس وقت جو شدید نفرت محسوس کی' وہ خود اس کے لیے بھی حیران کن تھی۔ اس نے رائفل کی نال بلا کے حلق پر لگائی اور ٹریگر دبا دیا۔ یہ احساس اسے بعد میں ہوا کہ اس نے کیا کیا ہے۔ وہ جبلی ردِعمل تھا۔

بلا کی آنکھیں پھیلیں۔ اس نے رائفل کی نال کو دونوں ہاتھوں سے دبوچا۔ کمال نے دوبارہ ٹریگر دبا دیا۔ بلا کے حلق سے خون کا فوارہ ابلا۔ کمال کی پینٹ کے پائینچے خون میں تر ہو گئے۔ خون جہاز کے فرش پر بھی بہہ رہا تھا۔ بلا کی گردن تقریباً جسم سے علیحدہ ہو گئی تھی۔

کمال سحر زدہ سا کھڑا بہتے ہوئے خون کو دیکھتا رہا۔ اس کے ذہن پر دھند سی چھانے لگی پھر بلا کے جسم نے ایک جھٹکا لیا تو وہ چونکا۔ اسے خیال آیا کہ ابھی اس کا کام پورا نہیں ہوا ہے۔

جہاز کے عقبی حصے سے اشوک کی آواز سنائی دی۔ "اب ہم ہر طرح سے پھنس چکے ہیں۔ ویگن بری طرح تباہ ہو گئی ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"پاگل ہو گئے ہو۔" گوپال بولا۔ "ویگن کا حشر دیکھ رہے ہو۔ اس میں تو کوئی بھی نہیں بچا ہو گا۔"

کمال نے فرش پر بہتے خون سے نظریں اٹھائیں۔ کیبن کے دروازے میں کیپٹن نوید ہاتھ میں شاٹ گن لیے کھڑا تھا۔

ادھر عقبی حصے میں اشوک کہہ رہا تھا۔ "اندر چلو۔ مجھے کچھ خوں ریزی کرنی ہے۔ ادھر سے نمٹ کر پھر کچھ سوچیں گے۔"

کمال نے رائفل بائیں ہاتھ میں تھامتے ہوئے جھک کر بلا کی بیلٹ سے ایک بم نوچ لیا۔ بائیں بازو اور کندھے میں ہونے والی تکلیف کی اب اسے کوئی پروا نہیں تھی پھر وہ پلٹ کر چلایا۔ "اپنی سیٹوں میں دبک جاؤ اور دونوں ہاتھوں سے کان بند کرلو۔ جھک جاؤ....."

خود جھک کر رائفل کو بائیں پہلو سے لپٹاتے ہوئے اس نے بم کی پن کھینچی اور اسے پردے کی طرف اچھال دیا' جسے اسی لمحے ایک طرف ہٹایا گیا تھا۔ ساتھ ہی اس نے خالی سیٹوں کے درمیان چھلانگ لگا دی۔ دھماکے نے جہاز کو ہلا ڈالا۔ دھات کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس کے سر کے اوپر سے اڑتے ہوئے گئے۔

اس کی طبیعت پھر بگڑنے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ وہیں پڑا رہے اور کچھ دیر آرام کرلے لیکن اسے یاد تھا کہ اسے کام مکمل کرنا ہے۔ وہ کوشش کرکے سیٹوں کے درمیان سے نکلا اور پردے کی طرف جھپٹا۔ اس نے پردے پوری طرح ہٹائے۔ وہاں زہریلا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ اسے پھندا لگ گیا اور اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔ وہ کسی نرم چیز سے ٹھوکر کھا کر لڑکھڑایا۔ وہ لاش تھی۔ اس نے غور سے دیکھا۔ وہ گوپال تھا۔ اس نے چیک کیا وہ واقعی مر چکا ہے پھر وہ لپکتے قدموں سے آگے بڑھا۔ وہ تمام سیٹوں کو چیک کررہا تھا۔ جہاز کے بالکل عقبی حصے میں دروازے کے قریب اسے دو سیٹوں کے درمیان گوپال کا دوسرا ساتھی نظر آیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیٹ پر تھے۔ وہ کھانسنے کے دوران کراہ رہا تھا۔

کمال نے ایک ہاتھ کی مدد سے رائفل بلند کی اور اس کے سینے کے درمیان گولی ماری۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے کی طرف جا گرا۔

اب اسے اشوک کی تلاش تھی لیکن اشوک جہاز میں موجود نہیں تھا۔ یعنی وہ جہاز سے نکل چکا تھا۔

کمال دروازے کی طرف لپکا جو سیڑھی دروازے سے لگائی گئی تھی اس کے چیتھڑے اڑ چکے تھے۔ اب چھلانگ لگانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا اور اس کی جسمانی حالت ایسی نہیں تھی لیکن اس پر جنون طاری ہو رہا تھا۔ اس نے احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کہیں اشوک چھپا ہوا نہ ہو۔ مطمئن ہو کر اس نے پہلے رائفل پھینکی اور پھر خود چھلانگ لگا دی۔ اس نے چھلانگ لگاتے ہوئے یہ خیال رکھا تھا کہ وہ دائیں ہاتھ کے بل گرے۔ اس کے باوجود اس کے جسم کے بائیں حصے میں اذیت کی لہر دوڑ گئی۔

چند لمحے وہ یونہی ساکت پڑا رہا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ اٹھ سکے گا۔ رائفل اس سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر پڑی تھی لیکن اسے اٹھانا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ اس کی نظر تباہ شدہ ویگن

پر پڑی پھر جا بجا بکھرے ہوئے انسانی اعضا نظر آئے لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ یہ سب کیسے ہوا ہوگا۔

بالآخر قوتِ ارادی اور کام مکمل کرنے کی ضرورت کے احساس نے اسے تقویت دی اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے رائفل اٹھائی اور جہاز کے عقب کی طرف بڑھنے لگا۔ اچانک اسے اشوک بھاگتا نظر آیا۔ اس نے رائفل سیدھی کی لیکن فوراً جھکالی۔ فاصلہ زیادہ تھا۔

وہ بھی اسی طرف بھاگنے لگا۔ اشوک نے بھاگتے بھاگتے پلٹ کر اسے دیکھا اور اپنی رفتار بڑھادی۔ کمال کو یقین نہیں تھا کہ وہ اشوک تک پہنچ سکے گا لیکن جب تک ٹانگوں میں جان تھی، وہ اس تعاقب سے دستبردار نہیں ہو سکتا تھا۔ اشوک کے ہاتھ میں بھی رائفل تھی۔

○☆○

اشوک نے پلٹ کر دیکھا تو اسے بس ایک ہیولا نظر آیا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ وہ کیپٹن نوید ہوگا۔ صرف وہی، اس کے منصوبوں کا بیڑہ غرق کرنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا۔ وہ کچھ زیادہ ہی ریلیکس کر گیا تھا۔ ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا مظاہرہ کیا تھا اس نے۔ اسے پہلی فرصت میں یرغمالیوں کو بھی ختم کر دینا چاہیے تھا اور جہاز کے کریو کو بھی۔

اور اب وہ خوف زدہ بھی تھا۔ اسے احساس ہوگیا تھا کہ اب اسے جان بچانے کے لیے بھی جدوجہد کرنا ہوگی۔ یہ اس کے لیے نئی بات تھی۔ اب تک وہ ایسی کسی صورتِ حال سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ مقابلہ کرنے کے لیے وہ دوسروں کو استعمال کرنے کا عادی تھا۔ اب تک اس کا واسطہ نہتے لوگوں سے پڑا تھا۔ کمزور لوگوں سے یا ایسے لوگوں سے، جنہیں اس نے بے خبری میں مار لیا تھا۔ اب تک اسے زندہ رہنے کے لیے جدوجہد نہیں کرنی پڑی تھی۔ سو اب وہ متوحش تھا۔

اچانک وہ کسی چیز سے ٹکرا کر گرا۔ وہ سڑک کوٹنے والا انجن تھا۔ یہ وہ مقام تھا، جہاں سڑک کی تعمیر کرنے والے آلات اور سڑک کی تعمیر میں استعمال ہونے والے سامان کا ذخیرہ کر دیا گیا تھا۔ یہ اچھی جگہ ہے۔ اس نے اٹھتے ہوئے سوچا۔ اچھا خاصا قلعہ ہے یہ۔ یہاں سے وہ کیپٹن کو نشانہ بنا سکے گا۔

وہ اٹھ کر اندھا دھند آگے بڑھا اور پھر کسی چیز سے ٹکرایا۔ اچانک اس پر کوئی بھاری چیز گری۔ وہ نیچے گرا اور اس لمحے کوئی اور بھاری چیز اس کی ٹانگ پر گری۔ آواز سنتے ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ اس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ تکلیف کا احساس اسے بعد میں ہوا تھا۔ چیخا بھی وہ بعد میں ہی تھا۔

وہ بہت بے ڈھنگا گرا تھا۔ بھاری چیز اب بھی اس کی ٹانگ پر گری ہوئی تھی اور ٹانگ کو وہ ہلا بھی نہیں سکتا تھا۔ تکلیف کے باوجود اس نے خود کو اٹھاتے ہوئے بھاری چیز کو ہاتھ سے دھکیل کر گرانے کی کوشش کی لیکن وہ اسے نہ ہلا سکا۔ اس لمحے اسے احساس ہوا کہ وہ سیمنٹ کی بوری ہے۔

وہ سڑک کوٹنے والے انجن کی اوٹ میں تھا۔ انجن کے پیچھے وہ بوریوں کی دیوار سی تھی، جس سے وہ ٹکرایا تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ یہ اس کی خوش قسمتی ہے کہ گرنے والی پہلی بوری نے اس کی گردن نہیں توڑ ڈالی لیکن اب بھی وہ اچھے حال میں تو نہیں تھا۔

اس نے انجن کے نچلے حصے سے باہر دیکھا۔ اس کے تعاقب میں آنے والا اب کافی قریب آگیا تھا۔

○☆○

کمال نے اشوک کو رولر انجن سے ٹکرا کر گرتے دیکھا پھر وہ اٹھا اور آگے بڑھا۔ کمال کو انجن کے عقب میں بوریوں کی دیوار سی نظر آئی۔ درحقیقت وہ بوریوں کا کمرا سا تھا۔ اشوک اندھا دھند اسی طرف گیا تھا پھر اگلے ہی لمحے اسے دھما کا سنائی دیا تھا۔

کمال نہیں سمجھ سکا کہ کیا ہوا ہے لیکن اسے یقین ہوگیا کہ اشوک اب اس کے ہاتھ سے نہیں بچ سکے گا۔ وہ زیادہ دیر تو وہاں محصور نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے طمانیت سے سوچا کہ اب تمام حساب چکانے کا وقت آگیا ہے۔ ہر وہ تکلیف جو اس دہشت گرد نے اسے پہنچائی تھی، ہر وہ انسانی جان جو اس نے لی تھی..... ہر چیز کا حساب لینا ہے اس سے۔ اگر اشوک سیدھا بھاگتا جاتا تو اس کے لیے کوئی امکان نہ رہتا اس تک پہنچنے کا لیکن اب وہ پھنس چکا تھا۔

وہ بھاگتے بھاگتے رک گیا۔ اب وہ پُراعتماد قدموں سے رولر

ازدواجیات

شوہر نے اندر آکر بیوی کو بتایا "باہر ایک فلاحی انجمن کے نمائندے آئے ہیں۔ وہ غریبوں کی مدد کے لئے پرانے کپڑے مانگ رہے ہیں۔ کیا گھر میں کچھ پرانے کپڑے ہیں جو انہیں دیئے جاسکیں؟"

بیوی ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولی "ہاں۔ ایک تو تم اپنی وہ نیلی شلوار قمیص دے دو جو تم پچھلے پانچ سال سے پہن رہے ہو۔ دوسری میری وہ پیلی ساری دے دو جو میں پچھلے ماہ لائی تھی۔"

○☆○

شادی کے بعد دو سہیلیاں آپس میں ملیں "تمیں کیا کرتی، میں بہت مجبور تھی" پہلی سہیلی نے کہا۔

"کیا مطلب؟" دوسری نے پوچھا "تم نے مجبوراً اس سے شادی کی مگر کیوں؟"

"اس شخص سے نمٹنے کا کوئی اور طریقہ میرے پاس نہیں تھا" پہلی سہیلی نے جواب دیا۔

انجن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ انجن سے دس فٹ دور رہا ہوگا کہ فائر ہوا۔ گولی اس کی بائیں ران میں پیوست ہوئی تھی۔ وہ گرا۔ گرتے ہی اسے رولر انجن کے عقب میں گرا ہوا اشوک نظر آیا۔ وہ بے بسی کے عالم میں لیٹا ہوا تھا۔ اس کی ٹانگ پر سیمنٹ کی بوری گری ہوئی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے .... اذیت اٹھا کر فائر کرنے کے لیے پوزیشن بنائی ہوگی۔

کمال کی ذہنی کیفیت اب ایسی تھی کہ وہ تکلیف کے ہر احساس سے ماورا ہو چکا تھا۔

○☆○

اشوک یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ آنے والا کون ہے۔ اسے اس کی ٹانگیں تو نظر آرہی تھیں لیکن بالائی جسم اور چہرہ رولر انجن کے عقب میں تھا۔ اس نے اپنی پوزیشن بناتے ہوئے رائفل کو سیمنٹ کی اسی بوری پر ٹکایا، جو اس کی ٹانگ پر پڑی ہوئی تھی۔ درد اب اس کی برداشت سے باہر ہوا جارہا تھا۔

اس شخص پر فائر کرنے میں اسے کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہو رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جہاز کے عقبی حصے میں موجود اس کے دو ساتھی بم پھٹنے کے نتیجے میں اگر ہلاک نہیں بھی ہوئے تھے تو شدید زخمی ضرور ہوئے ہوں گے۔ ان کے جہاز سے باہر آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ مشکور جہاز کے کیبن میں تھا اور وہ حکم کا بندہ بغیر ہدایت کے کچھ کرنے کا قائل نہیں تھا۔ اب یہی امکان رہ گیا تھا کہ آنے والا جہاز کے کریو میں سے کوئی ہے۔

اس نے بڑی احتیاط سے نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔

گولی آنے والی کی ران میں لگی۔ ٹانگ ایک جھٹکے سے ہٹی۔ پھر وہ شخص اُچھل کر گرا....

اشوک کو اپنے دل کی دھڑکن رکتی محسوس ہوئی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس کے سامنے کمال رشید تھا۔

اس سے پہلے کہ اشوک حیرت سے سنبھلتا، کمال اُچھل کر سامنے سے ہٹ گیا۔ اشوک کی چلائی ہوئی چھ گولیاں عین اس جگہ لگیں، جہاں چند لمحے پہلے زمین پر کمال گرا ہوا تھا۔ ادھر ٹانگ کی تکلیف بڑھ رہی تھی۔ وہ اس پوزیشن میں رہ کر زیادہ دیر مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے سیمنٹ کی بوری کو ہٹا کر پھنسی ہوئی ٹانگ کو نکالنے کی کوشش کی۔ ٹانگ کا حال خواہ کچھ بھی ہو، لیکن اب وہ اس قید سے آزاد ہونا چاہتا تھا۔ یوں تو کمال اسے باآسانی ختم کر دیتا۔

اس نے پورا زور لگایا۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی لیکن وہ بوری کو نہ ہٹا سکا۔ البتہ بوری ذرا سی سرکی تھی اور اس کی ٹانگ پر قیامت گزر گئی تھی۔

داہنی سمت سے اسے آہٹ محسوس ہوئی۔

کمال زمین پر گرا ہوا سینے کے بل آگے بڑھ رہا تھا۔ اشوک نے رائفل تھامتے ہوئے اپنے جسم کو داہنی جانب موڑنے کی کوشش کی لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ کمال کی رائفل کی نال، اس کی گردن سے بمشکل چھ انچ دور تھی۔

”کمال رشید.... تم مجھے زندہ بھی گرفتار کر سکتے ہو۔“ اس نے التجا کی۔

”تمہیں گرفتار کرنا میرا کام نہیں۔“ کمال نے سرد لہجے میں کہا ”تم میرا ذاتی معاملہ ہو۔“

”میں را کا ایجنٹ ہوں۔ بہت قیمتی معلومات فراہم کر سکتا ہوں۔“

کمال نے چند لمحے سوچا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس زیادہ مہلت نہیں ہے۔ اب وہ سانپ کی گردن پر ہاتھ ڈال چکا تھا۔ ایک لمحے کی کوتاہی بھی ہوتی تو وہ خود ڈسا جاتا۔ اس کی اپنی حالت اچھی نہیں تھی۔ ران سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ صرف قوتِ ارادی کے زور پر کوئی کتنا چل سکتا ہے۔ ”مجھے اس سے کوئی غرض نہیں اشوک۔ تم میرا نہیں، اور لوگوں کا دردِ سر تھے۔ وہ تمہیں دور نہ کر سکے تو وہ جانیں۔ تم پاکستان میں داخل ہوئے۔ تم نے اتنی بڑی کارروائی کی۔ یہ ہماری وزارتِ داخلہ کی اور ہماری سیکیورٹی ایجنسیوں کی نااہلی ہے۔ میں تو وہی کچھ کروں گا جو کر سکتا ہوں۔“

”پلیز، میری بات سُنو۔“ اشوک گڑگڑایا۔

”سوری۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

”سنو کمال....“ اشوک ہذیانی انداز میں چلایا۔

”جی تو چاہتا ہے کہ تمہیں اسی طرح ختم کروں، جس طرح تم مجھے ختم کرنا چاہتے تھے لیکن میں نہ بے رحم ہوں نہ دہشت گرد۔ تاؤ کو تو ہیل....“ کمال نے ٹریگر دبا دیا۔ اس کے بعد چند منٹ اسے کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔

آنکھ کھلی تو اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اب جسم کسی مشقت کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ چلو چھوڑو۔ اس نے خود سے کہا۔ اب تمہیں کون سا کوئی اہم کام کرنا ہے۔ اب تو آرام کر لو کچھ دیر۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

جانے کتنی دیر بعد اسے آتے ہوئے قدموں کی آہٹیں سُنائی دیں لیکن اس سے آنکھیں نہیں کھولی گئیں پھر کسی نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ ”کیسے ہو کمال؟“ وہ صوفیہ کی آواز تھی۔

اس نے بولنے کی کوشش کی۔ اس کے ہونٹ ہلے لیکن کوئی آواز نہ نکلی۔

”سر.... آپ تو سچ مچ ہیرو ہیں.... مردِ میدان۔“ وہ رئیس کی آواز تھی۔ ”اب میں آپ سے سب کچھ سیکھوں گا سر۔“

وہ مسکرایا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں تک پہنچی یا نہیں۔ بس اس کے بعد اس کا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔ اسے یقین تھا کہ اب اس کی آنکھ روشنیوں میں کھلے گی۔

باب